عشق آتش

امین کنجاہی



عشق آتش

امین کنجاہی

مکتبۂ پاک ادب، لاہور

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ

اشاعت	اپریل 2021
ضخامت	176 صفحات
ناشر	مکتبۂ پاک ادب
ایڈیٹر	طیبہ بخاری
خصوصی معاون	سید صداقت علی شاہ
تکنیکی معاونت	ساؤتھ ایشیاء میڈیا سروس (SMS) این ایس ٹیکنالوجیز پرائیویٹ لیمیٹڈ
قانونی مشیر	حماد انصاری ایڈووکیٹ
طابع	طیب اقبال پرنٹرز
قیمت (پاکستان)	400 روپے
قیمت بیرون ملک	3 ڈالر

کتاب منگوانے کا پتہ: E 76 لاہور پریس کلب ہاؤسنگ سکیم ہربنس پورہ، لاہور

0321-4270363 = 0308-4277410

مکتبۂ پاک ادب

ایم 42 آئی ٹی ٹاور 73 ای ون خالی روڈ گلبرگ تھری، لاہور

ترتیب

دل کی بات

مجھے بچپن سے ہی اُردو ادب اور شاعری کا شوق رہا ہے، ہمارے گھر میں والد صاحب علامہ اقبالؒ کا بہت ذکر کیا کرتے تھے، اُن کی کتابیں ہمارے گھر میں آج تک پڑی ہوئی ہیں جن کے پبلشر شیخ مبارک علی، تاجر کتب، اندرون لوہاری دروازہ لاہور، اور یہ کتاب کپور پرنٹنگ ورکرز ایبٹ روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ میں بات کر رہا ہوں علامہ اقبالؒ کے پہلے اُردو مجموعہ ''بانگِ درا کی'' ہم نے اپنی اوائل عمری میں ہی بانگِ درا، بالِ جبرئیل، اور ضربِ کلیم پڑھ لی تھیں، اِن تینوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد علامہ اقبالؒ کی شاعری سے ہمیں عشق ہو گیا، کیونکہ اُن کی شاعری جو قومیت سے شروع ہوئی پھر ضرب کلیم کے شائع ہونے تک آفاقیت میں تبدیل ہو گئی۔ علامہ کے علاوہ مجھے کلاسیکل اُردو ادب پڑھنے کا موقع ملا، نثر میں مرزا محمد ہادی رسوا، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا فرحت اللہ بیگ، کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، رابندر ناتھ ٹیگور، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے اُردو افسانے اور کہانیاں اور پھر سعادت حسن منٹو، ان سب نے مجھے کہانی لکھنے کا اسلوب دیا۔

میں نے کئی برس یہ سوچنے میں لگا دیئے کہ افسانہ کیسے لکھوں، کئی برس تک میرے اندر یہ کشمکش چلتی رہی، کہ امین کنجاہی، تو نے پنجابی شاعری کر لی، اُردو شاعری کر لی، کالم نویسی کر لی۔ کہانی لکھ، کہانی لکھ، اِسی کشمکش میں میں نے اپنی زندگی کا پہلا افسانہ ''کلمہ شہادت'' لکھا اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری کہانی کا اسلوب اور طریقہ کار، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی دین ہے۔ میری کہانیوں کا نچوڑ اور میرے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، بولتے ہوئے مجھے نظر آتے ہیں، جب میں قلم اُٹھاتا ہوں تو مجھے ایسے

لگتا ہے جیسے میرے اندر وہ تمام ہستیاں آ گئی ہیں جنکا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں وہ مجھ سے وہ کچھ لکھوا رہے ہیں جو عام لوگ اور عام لکھنے والا سوچ سکتا ہے، مگر لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ اُسے دُنیا کا ڈر ہے، اُسے ادب کے جعلی پنڈتوں سے خوف آتا ہے۔ آپ اسے بدقسمتی کہیں یا خوش قسمتی کہ میں نے آج تک جو کام بھی کیا بڑی ایمانداری سے کیا ہے، بھلے وہ عشق ہو، ریڈیو پر کام ہو، کالم نویسی ہو، شاعری ہو، یا پھر افسانہ، میرے اندر کی روح ہمیشہ بے چین رہتی ہے، اور اِسی بے چینی کے عالم میں میرے اندر ''عشق آتش'' کی آگ سلگ پڑی اور میں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ترتیب دے دیا، اور اِس میں میرے ساتھ مولا خوش رکھے، محترمہ طیبہ بخاری نے بہت زیادہ ساتھ دیا ہے، جن کا میں عمر بھر مقروض رہوں گا۔ اب خیر عمر تو اتنی نہیں رہی مگر جتنے سال مہینے اور دن باقی رہ گئے ہیں، میں محترمہ طیبہ بخاری اور ان کے ''مکتبۂ پاک ادب'' کا مقروض رہوں گا جو عزت اُنھوں نے مجھے دی میں اُس کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ میں اُن کی یہ خوش آمد کر رہا ہوں، نہیں اُنھوں نے میرے افسانوں کی کتاب کو شائع کرنے میں مجھ سے زیادہ محنت اور مخلص ہو کر کام کیا ہے، مولا پنجتن پاک کے صدقے اللہ تبارک و تعالیٰ محترمہ طیبہ بخاری کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ جہاں تک میرے افسانوں کا تعلق ہے، میں اپنی کہانیاں اپنے اِردگرد کے ماحول سے اخذ کرتا ہوں، اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، اپنے کانوں سے سُنتا ہوں اپنے کرداروں کی آوازیں، اور پھر اپنے ہاتھوں میں قلم پکڑ کر اُن کرداروں کی تصویریں لفظوں سے بنا کر، اخبارات اور رسائل میں شائع کرنے کے لئے بھیج دیتا ہوں۔

کہانی لکھنا بہت مشکل کام ہے، اِس کے لئے خونِ جگر دینا پڑتا ہے، اپنے کاسۂ دل سے سچائی کے سکے، بڑی جرأت کے ساتھ دُنیا کے سامنے پھینکنے پڑتے ہیں، تب جا کر کہانی مکمل ہوتی ہے، ویسے دیکھا جائے تو ہر شخص ایک کہانی ہے، میں بھی کہانی، آپ بھی کہانی، ہر انسان کہانی، ہم سب ایک کہانی ہیں اور اس کہانی کا سب سے بڑا رائٹر، رب العزت ہے، جس نے دُنیا میں حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ کو بھیج کر پہلی کہانی تحریر کی۔ اُس کے بعد، تمام دُنیا کے ذہین لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے کہانیاں لکھیں، مگر مجھے جس کہانی کار نے سب سے زیادہ متاثر کیا، خاص طور پر مغربی

کہانی کاروں میں اُن میں فرانس کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس موپساں، لاطینی امریکہ کے ناول نگار صحافی مصنف گیبریئل گارسیا مارکیز، بیسویں صدی کا بہترین ناول نگار فرانز کافکا، روس کے مشہور انقلابی شاعر ناول نگار افسانہ نگار ڈرامہ نویس صحافی میکسم گورکی، اور روس کے ہی ڈرامہ نگار مضمون نگار فلسفی لیو ٹالسٹائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مگر کہانی میں، میں جنہیں اپنا اُستاد مانتا ہوں وہ صرف اور صرف سعادت حسن منٹو ہیں انہوں نے اپنے مرنے سے پہلے اپنی قبر کا کتبہ تیار کروایا تھا جس پر ''کہانی'' اور ''کہانی کار'' کا ذکر تھا۔ یہ کتبہ اُن کی قبر پر چند ناگزیر وجوہات کے بناء پر آویزاں نہ ہو سکا، میں بھی سعادت حسن منٹو کے قبیلے کا ایک رکن ہوں اور اپنے پڑھنے والوں سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ میرے افسانوں کو اُردو کی تحریر سمجھ کر نہیں پڑھیں گے، بلکہ میرے خونِ جگر کے قطروں کو محسوس کرتے ہوئے پڑھیں گے۔ آخر میں ''فن کدہ پاکستان'' کے پلیٹ فارم کا تہہ دل سے مشکور ہوں جس نے مجھے یہ موقع اور حوصلہ دیا کہ میں اپنے افسانوں کو آپ سب کے سپرد کر سکوں۔

فقط دُعا گو

امین کنجاہی

12-03-2021

درویش لکھاری

اہلِ علم وادب ایک اچھے افسانہ نگار میں درج ذیل خوبیوں کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں

☆: مطالعہ وسیع ہونا چاہئے۔۔۔

☆: تنگ نظری سے اجتناب برتا جائے، وسیع القلب ہونا چاہیے۔۔۔۔

☆: ملکی وبین الاقوامی حالات پر گہری نظر ہو۔۔۔

☆: زبان پر عبور حاصل ہو۔۔۔چند دیگر زبانوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔۔۔

☆: ادب کی دیگر اصناف کی سُدھ بُدھ ہو۔۔۔فنون لطیفہ کا بھی تھوڑا بہت علم ہو۔۔۔

☆: صبر اور ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، دوسروں کی رائے کا احترام کرے۔۔۔

☆: نئے نئے تجربے کرتا رہے۔۔۔

☆: مختلف خیالات میں سے سب سے عمدہ خیال چُنے پھر منتخب خیال کو مشاہدے کی دھوپ اور تجربے کا پانی دے۔۔۔

یہ تمام اہم باتیں، نکات، احتیاطی تدابیر یا مہارتیں ایک طرف بعض افسانہ نگاران کے بغیر بھی افسانہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگران کے تحریر کردہ افسانے کاغذی پھول کی حیثیت رکھتے ہیں جو ''قدرتی گلاب'' کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ امین کنجاہی صاحب کے افسانوں کا شمار بھی انہیں قدرتی گلابوں میں ہوتا ہے ''عشق آتش'' ایک انتہائی عمدہ کاوش ہے جس میں مطالعے کی وسعت کیساتھ ساتھ خلقِ خدا کے مسائل اور زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

سادہ زبان میں افسانے کو اپنے تجربے اور انوکھے انداز کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں

امین کنجاہی

ملکی و بین الاقوامی حالات پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں

صبر و ضبط کا دامن تھامے اپنی بات قاری کے سپرد کرنے کی مہارت بھی ان کی تحریر میں ملتی ہے سادہ مزاج تو ہیں ہی۔۔۔سب کو عزت دینے کا ظرف اُن میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔۔۔اپنے سے کم عمر افراد کو بھی خود سے بڑا اور اچھا سمجھتے ہیں، ہوس، لالچ، غرور اور طبقاتی اونچ نیچ میں الجھے معاشرے میں ایسے ''درویش'' کم ہی ملتے ہیں، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس ایسا درویش ہے جس کے پاس، افسانہ، کہانی، کالم، شاعری گرجدار آواز اور ہاتھ میں لاٹھی بھی ہے۔ ۔۔جو بداخلاق، مغرور، انتہا پسند بالکل بھی نہیں۔۔۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ امین کنجاہی صاحب نے مجھے اپنی تحریر کیساتھ کھل کر'' کام'' کرنے کا موقع دیا، میں نے دل و جان سے کوشش کی ہے کہ اُن کا عوامی انداز نہ بدلے اور جن حدود و قیود میں رہ کر کام کیا جاسکتا ہے اس کی پاسداری کرتے ہوئے ''عشق آتش'' کو ادب کے سپرد کیا جائے۔ اللہ اور اس کی نیک ہستیوں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اس کاوش میں کامیابی ملی اور ادب کی خدمت کا عظیم فریضہ انجام پایا۔

بقول قیصر خالد

آتشِ عشق سے بچئے کہ یہاں ہم نے بھی
موم کی طرح سے پتھر کو پگھلتے دیکھا

پتھروں کو کیسا پگھلایا جاتا ہے یہ جاننا ہے تو ''عشق آتش'' سے بچنے کی کوشش ہرگز مت کیجئے گا بلکہ اس سے دوستی کرلیں، خود کو اس کی لپٹوں کے سپرد کردیں۔۔۔''مکتبۂ پاک ادب'' کے پلیٹ فارم سے اور ''فن کدہ پاکستان'' کے تعاون سے ''آتشِ عشق'' کی لپٹیں بلند ہو چکی ہیں، جنید اختر کا کیا خوب شعر ہے کہ

جن سے اٹھتی ہیں سیہ آگ کی لپٹیں ہر دم
ہم نے ایسی بھی زمینوں میں شجر کاری کی

ہم نے ''علمی شجر کاری'' کا آغاز کر دیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ ''آلودگی'' کو ہر صورت کم کرنا ہے، آنیوالی نسلوں کو ''صاف ستھرا'' ماحول فراہم کرنا ہے تاکہ جیو اور جینے دو کا تصور پروان چڑھ سکے، نفرتوں، کدورتوں، انتہا پسندی کا خاتمہ ہو سکے۔ صبر و تحمل رواداری اور بھائی چارے کا جذبہ فروغ پا سکے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ ''عشق آتش'' افسانوی دنیا میں ''چاند'' کی حیثیت حاصل کرے گا، وہ اہلِ علم جو دن بھر کی تھکان کے باوجود رات کے اندھیرے میں کتاب سے ملاقات کیے بغیر نیند کا استقبال نہیں کرتے ان کیلئے عرض ہے کہ

دن بھر سورج ڈھویا ہے
چاند سے پلٹیں اور سو لیں

ادب کے چاند ''عشق آتش'' سے ملاقات کریں، نیند سے پہلے مطالعے کا ذوق پورا کریں، کیونکہ

آتشِ عشق جب جلاتی ہے
جل کے میں نوش جام کرتا ہوں

علم و ادب کا یہ ''جام''۔۔۔ ''عشق آتش'' ہے جس کا نام۔۔۔ ہمارے اور آپ سب کے قابل احترام۔۔۔ درویش لکھاری امین کنجاہی کے نام

ناشر/ایڈیٹر

طیبہ بخاری

16-3-2021

سانوں لگ گئی بے اختیاری

میں گاڑی چلا رہا تھا، شدید بارش ہو رہی تھی بارش بھی سردیوں کی، رات کا ٹائم تھا اور وائپر چلانے کے باوجود گاڑی کی سکرین مجھے صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی، گاڑی چلاتے ہوئے مجھے کافی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ گاڑی کہ شیشے سارے بند تھے تو سانس لینے کی وجہ سے گاڑی کی سکرین پر دھند سی چھا جاتی تھی، وہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی، بالکل چپ چاپ گم سم ایسے کہ جیسے کوئی کسی نے اُس کے بُت میں سے جان نکال لی ہو، میں نے ایک دو دفعہ اُسے غصے بھری نظروں سے دیکھا، پھر شاید اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے گاڑی میں سے ڈسٹر اُٹھایا اور گاڑی کی ونڈ سکرین صاف کرنے لگی، اُس کے اِس عمل سے مجھے تھوڑا سا بہتر دکھائی دینے لگا مر بارش بہت تیز تھی۔ میری گاڑی ویسے بھی پُرانے ماڈل کی تھی، سڑک پر جب پانی کھڑا ہوا ملتا تو مجھے یہ ڈر رہتا کہ گاڑی بند نہ ہو جائے۔ ہم دونوں نے کافی دیر تک آپس میں کوئی بات چیت نہ کی میرے دماغ میں ایک فلم چل رہی تھی، جب میری اُس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، وہ سُرخ لباس پہنے ہوئے بالکل گلاب کا پھول لگ رہی تھی، یہ ایک یورپی ایمبیسی کی طرف سے دیئے گئے ڈنر کا واقعہ ہے جو کہ اسلام آباد کے بڑے ہوٹل میں دیا گیا تھا۔ اتفاق سے اُس ڈنر میں، میں بھی شامل تھا اور وہیں پر میری اور اُس کی آنکھیں چار ہوئیں، میں بنیادی طور پر خوبصورتی کے حوالے سے بہت زیادہ دل پھینک ثابت ہوا ہوں۔ اکثر میرے یار مجھے کہتے ہیں کہ تو بہت جلدی کرتا ہے جتنی جلدی تو کسی خوبصورت چہرے کے قریب ہوتا ہے، اُتنا ہی جلدی وہ تجھے واپس لوٹا دیتا ہے اور پھر تو کافی عرصے تک اپنے کمرے میں بیٹھ کر ڈپریشن کا شکار رہتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔

فرح کے ساتھ بھی میرا تعارف میرے ایک دوست نے کروایا اُس نے سرسری سا مجھے دیکھا اور اِگنور کرنے کے انداز میں ہائے، ہیلو کیا، مگر میرے دل کے اندر جو بچہ ہے، وہ بچہ جو تھوڑا کچا ہے، انوکھے لاڈلے کی طرح ضد کرنے لگ پڑتا ہے کہ میں نے کھیلنے کے لئے چاند لینا ہے، جو کہ بہت ہی مشکل کام ہے بلکہ ناممکن ہے۔ میری اور فرح کی پہلی ملاقات ہوئی، جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا کہ یورپی ایمبیسی کی طرف سے دیا گیا ڈنر تھا جس میں بار کا بھی انتظام تھا، زیادہ تر مہمان بار اٹینڈنٹ کی طرف جاتے اور اپنی اپنی مرضی کی شراب جام میں ڈال کر لے آتے، فرح بھی گئی اور اُس نے ریڈ وائن کا کہا، میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر پیچھے چلتا ہوا بار کے قریب گیا، اور میں نے Scotch Visky کا آرڈر دیا۔ میں اپنا آرڈر لے کر ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا فرح مجھے بڑی چلبلی، تیز طرار سی خاتون محسوس ہوئی جو کہ ہر ایک سے ہنسی مذاق کر رہی اور خوشی سے مل رہی تھی، لیکن کوئی شخص فرح کے قریب زیادہ ہونا چاہتا تو وہ ایک دم سے اُسے شٹ اپ کال دیدیتی اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا۔ اب میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ میں بھی کسی طرح سے فرح کے قریب ہو جاؤں مگر ڈر تھا کہ فرح مجھے بھی جھڑک دے گی، اِسی کشمکش میں، میں نے وِسکی کے 2 پیک پیئے اور جب تیسرا لینے کے لئے بار میں گیا تو ویٹر نے کہا'' سروِسکی ختم ہوگئی ہے'' میں نے اُس سے پوچھا'' باقی کیا بچا ہے؟'' اُس نے جواب دیا سر ریڈ وائن اور وائٹ وائن۔ میں نے کہا اِن دونوں کو ملا کر'' مجھے ایک جام اور بنا دو'' اُس کے بعد کھانے کے اعلان کیا گیا، سب لوگ کھانا کھانے کے لئے لائن میں لگ گئے اور اپنی اپنی پلیٹ اُٹھا کر بوفے ٹیبلز پر اپنی اپنی مرضی کا کھانا چننے لگے، میں نے بھی چکن کڑاہی اور دو پیس روغنی نان کے اُٹھا لئے، اور ایک ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔

میں کھانا کھا رہا تھا مگر میری نظریں فرح کا تعاقب کر رہی تھیں کہ اب وہ کہاں جا رہی ہے، کس کے پاس کھڑی ہوئی ہے؟ مجھے اُس کا کسی اور کے پاس کھڑے ہونا پسند نہیں آ رہا تھا، ایک الجھن سی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ میرا اور اس کا کوئی تعلق کوئی رشتہ نہیں تھا صرف پہلی ملاقات تھی، وہ بھی نامکمل سی ادھوری سی۔ کچھ دیر بعد ہوٹل کے دیوانِ خاص میں آہستہ آہستہ مہمان کھانا کھانے کے

بعد تصویریں بنوانے لگ پڑے اور میزبان ایمبیسیڈر صاحب نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ میں خاموشی سے فرح کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، میرے دوست اقبال نے محسوس کر لیا تھا کہ میں فرح کے قریب ہونا چاہتا ہوں۔ اُس نے فرح سے پوچھا، آپ کے پاس گاڑی ہے؟ تو فرح نے ایک دم سے اُسے جواب دیا، جی میرے پاس اپنی گاڑی ہے، پھر اقبال ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لے گیا، اُس نے کہا ''کاکا اِتھے دال نہیں گلنی'' جاؤ گھر جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔ میں نے اُس سے وعدہ لیا کہ یار مجھے فرح کا نمبر ضرور لے کر دینا، میں گھر آ گیا، گھر میں آ کر کسی سے کوئی بات نہیں کی چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر نیند کی گولی لی اور سو گیا۔ صبح اُٹھا تو حسب معمول سب سے پہلے موبائل اُٹھایا اور چیک کرنا شروع کیا، جب میں اقبال کا واٹس ایپ میسج دیکھا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اُس نے فرح کا نمبر بھیج دیا تھا۔

کچھ دن گزر گئے میری جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ کس حوالے سے کس طرح سے فرح کو فون کروں، پھر دماغ میں ایک ترکیب آئی، میں نے فرح کے نام کو فیس بک پر سرچ کیا تو فرح کی فیس بک آئی ڈی سامنے آ گئی میں نے اُسے فوراً ہی فرینڈری کیوسٹ بھیج دی۔ کافی دن گزر گئے، اقبال سے ملاقات ہوئی اُس نے پوچھا ''کاکا کوئی کہانی پائی ہے؟'' میں نے کہا نہیں یار بڑا مشکل لگتا ہے کیسے شروع کروں میں نے تو اُس سے فرینڈری کیوسٹ بھی بھیجی ہے ابھی تک اُس نے Accept نہیں کی۔ ایک دن میں اِسی طرح فیس بک دیکھ رہا تھا موبائل پر تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ فرح نے میری فرینڈری کیوسٹ Accept کر لی ہے، میں نے اُس نے میسنجر پر شکریہ کا میسج کیا، اُس نے بھی فارمل سا جواب بھیج دیا۔ مگر اتنا تو ہوا کہ رابطہ شروع ہو گیا۔

فرح مختلف محفلوں میں مختلف دوستوں کے ہاں ملتی رہی، آہستہ آہستہ ہماری بات چیت بڑھنے لگی، فرح کو مختلف ڈشوں اور کھانے کا شوق تھا اور اِس شوق میں اُس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ دوستیاں بنا رکھی تھیں، ایک دن میں نے بھی اُس سے کہا کہ چلو آج کھانا کہیں باہر کھائیں گے۔ اُس نے ایک دم سے کہا، ہاں اچھی بات ہے، ندیم تم ایسا کرو کہ Marriat کا بوفے بہت اچھا ہوتا ہے، وہاں چلتے ہیں، ٹھہرو میرے پاس نمبر ہے ابھی بکنگ کروا لیتی ہوں۔ میں

بڑا خوش ہو گیا کہ کسی بہانے فرح کا قرب تو نصیب ہو گا، اُس کے چہرے، اُس کی چمک، اُس کی خوشبو اُسے اپنے سامنے پا کر جو سکون اور طمانت مجھے ملے گی، پانچ ہزار روپے ڈنر پر لگانے میں مجھے کوئی دُکھ نہیں ہو گا۔ پھر بہانے بہانے سے کبھی پندرہ دن کبھی ایک مہینے بعد ہم دونوں کسی نہ کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانے کے بہانے ملا کرتے، مجھے کھانے کا اتنا شوق نہیں تھا، میں تو بہت کم مقدار میں کھانا کھاتا تھا مگر اُسے بہت شوق تھا، اُسے بولنے کا بھی بہت زیادہ شوق تھا اور میں ہاں ہوں نہیں میں بات کرتا تھا کیونکہ مجھے ڈر ہوتا تھا کہ کسی لفظ سے وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔

پھر ایک دن فرح کا فون آیا کہ آج کھانا تم میرے فلیٹ پر کھاؤ گے میرے ساتھ، میں تھوڑا سا پریشان ہوا کہ فلیٹ پر جاؤں کہ نہ جاؤں کیونکہ میں بنیادی طور پر ایک بزدل انسان ہوں، پھر میں نے ہمت کر کے حامی بھر لی۔ وہ G-8 میں تندوری ریسٹورنٹ کی بیک سائیٹ پر ایک بلڈنگ کے چوتھے فلور پر اکیلی رہتی تھی، جب میں فلیٹ میں داخل ہوا تو اندر ایک چھوٹا سا ٹی وی لانج تھا، وہاں پر اُس نے مجھے بیٹھا دیا اور خود کچن میں چلی گئی۔ ایک گلاس میں پانی لا کر اُس نے میرے قریب پڑے ٹیبل پر رکھ دیا اور پوچھا چائے پر پیو گے ندیم؟ میں نے کہا ہاں پلا دو اگر موڈ ہے تو؟ کہنے لگی ہاں کھانے میں ابھی ٹائم ہے تو چلو ایک ایک کپ چائے کا پیتے ہیں، دس منٹ کے اندر وہ چائے لے آئی اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں اُس نے دیوار پر لگی ایل ای ڈی کو آن کیا اور پوچھنے لگی، ندیم تمہارا Favorite Singer کون ہے؟ میں نے کہا، مجھے تو انگریزی گانے کم ہی پسند ہیں نہ میری انگریزی اتنی اچھی ہے کہ اُسے سمجھ سکوں اِس لئے میں تو پاکستانی غزلیں، گیت اور لوک گیت سُننا زیادہ پسند کرتا ہوں، مجھے نصرت فتح علی خان، پٹھانے خان، محمد جمن اور ریشماں بہت پسند ہیں۔ اُس نے کہا کبھی ایلوس پریسلے کو سُنا ہے تم نے؟ میں نے کہا ہاں، سُنا تو ہے۔ پھر وہ بتانے لگی کہ ایلوس میرا پسندیدہ سنگر ہے، اب اپنا پسندیدہ گانا سُنانے لگ پڑی، گانا تھا، Are yor lone some tonight ایلوس کا انداز بڑا دھیما اور خوبصورت تھا، گو کہ مجھے اتنی انگریزی کی سمجھ نہیں آئی پھر بھی میں نے اُس کا دل رکھنے کے لئے گانے کی بڑی تعریف کی۔ وہ مجھے کیا کیا ایلوس کے بارے میں بتاتی رہی کہ جب

میں ٹین ایج میں تھی لندن میں پڑھتی تھی تو اُس وقت سے ایل وس پسند ہے، اُسے اس بات کا بھی بڑا دکھ تھا کہ ایل وس بہت جلد صرف 39 برس کی عمر میں 1977ء کو فوت ہوگیا جب وہ ابھی او لیولز میں پڑھتی تھی۔

پھر میرا اُس کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا کبھی وہ مجھے فون کردیتی کہ ایسا کرو ندیم ہم نے آج بنی گالہ ایک دوست کے فارم ہاؤس پر جانا ہے، تو تم مجھے میرے فلیٹ سے اُٹھا لینا ایک ہی گاڑی میں اکٹھے چلے جائیں گے۔ اُس دن بارش کافی ہورہی تھی، میرا دل نہیں کررہا تھا، جانے کو، مگر میرے اندر عجیب سا ایک نظام ہے کہ میں کسی کو نہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہاں کرسکتا ہوں، میں ڈبل مائینڈ ڈ رہتا ہوں۔ یہی بات اُس دن بھی ہوئی اور اُس نے فون ٹھک کرکے رکھ دیا، اب چار و ناچار مجھے جانا تھا، میں بددلی سے اُٹھا تیار ہوا گاڑی نکالی اور G-8 فرح کے فلیٹ کے باہر جا کھڑا ہوا۔ اُس کو ایس ایم ایس کیا کہ میں باہر گاڑی میں انتظار کررہا ہوں، اُس نے تھوڑی دیر بعد اپنے فلیٹ کی بالکنی سے مجھے دیکھا اور اشارہ کیا کہ دو منٹ میں آرہی ہوں۔ ٹائم کی بڑی پابند تھی وہ ایگزیکٹ دو منٹ میں تیار ہوکر اپنے فلیٹ کے نیچے آگئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مجھے دیکھا تو کہا، تم فٹ نہیں لگ رہے کیا ڈپریشن میں ہو؟ میں نے کہا، چھوڑو دفعہ کرو۔ راستے میں باتیں کرتے ہوئے میں نے پوچھا، فرح میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے؟ اُس نے میری طرف دیکھا اور کہا، میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے خیریت ہے؟ میں نے کہا، ہاں خیریت ہے، مجھے کلئیر کرو۔ اُس نے کہا، دوستی کا۔ میں نے کہا دو برس ہوگئے مجھے اور تمھیں ملتے ہوئے، پہلے تو میں تمھیں ایک بات کلئیر کردوں کہ کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان ہر قسم کا Relationship ہوسکتا ہے مگر دوستی نہیں ہوسکتی، دوستی صرف مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے ہوسکتی ہے، مرد اور عورت کے درمیان دوستی نام کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔

فرح ایک دم چونکی اور کہا، کیا بکواس کررہے ہو ندیم تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے آج کیسی باتیں کررہے ہو؟ اِس دوران ہم کشمیر ہائی وے پر پہنچ چکے تھے اور بنی گالہ کی طرف مڑنے والے تھے، بارش زوروں پر تھی اور اِس کے بعد میری اور فرح کی کوئی مزید بات چیت نہ ہوئی۔ جب ہم فارم ہاؤس پہنچے

تو شام ہو چکی تھی، میں خاموشی سے جا کر ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا، اور فرح کسی تتلی کی طرح کبھی کسی مرد کے پاس، کبھی کسی جوان لڑکے کے پاس، خوش گپیاں لگانے میں مشغول ہوگئی۔ اتنے میں ویٹر آیا اور اُس نے مجھے ڈرنک پیش کیا، یہ ریگل شیواز وسکی تھی، میں نے جلدی سے ایک گھونٹ میں وہ سارا پی لیا۔ وہاں پر میوزک شو ہو رہا تھا اور گانے والا بڑا بے سُرا تھا، کوئی مزہ نہیں آ رہا تھا میوزک کا، اوپر سے مجھے فرح کے ساتھ جو بات چیت ہوئی تھی وہ دراصل میری ایک اور ناکام محبت کی کہانی بننے جا رہی تھی۔ جب شو ختم ہوا تو فرح میرے پاس آئی اور کہنے لگی ندیم، میں فیض صاحب کے ساتھ جا رہی ہوں یہ مجھے ڈراپ کر دیں گے۔ میں چپ چاپ کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہ گیا، آج پھر شدید بارش ہو رہی تھی، گاڑی میں دھند تھی، راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون، مجھ سے بات کرنے کو تیار نہیں تھی، بس خاموشی سے اُس گاڑی کی سکرین صاف کر رہی تھی۔ جب اُس کا گھر F-11/2 میں آ گیا تو اُس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے بغیر خدا حافظ کہے بناء اپنے گھر میں داخل ہوگئی، میں اُسے جاتے دیکھتا رہا، بارش اتنی تھی کہ اُس کا پورا بدن بھیگ چکا تھا، میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور یو ایس بی لگا کر محمد جمن کو سننے لگ پڑا،

یار ڈاڈی عشق آتش لائی اے سانوں لگ گئی بے اختیاری

سینے دے وچ نہ سمائی اے

بے وفا کون۔۔۔؟

07 جون 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے تقسیم ہند کا فارمولا منظور کرتے ہوئے باقاعدہ طور پر ریڈ کلف ایوارڈ مان لیا، جب یہ اعلان ہوا تو جو لوگ مسلم ہندوستان میں آباد تھے اُن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان لوگوں نے جو وہاں آباد تھے جن کے آباؤ اجداد کی قبریں تھیں اُن میں سے اکثر نے بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اِن لوگوں کے خیال میں بلکہ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہم جب پاکستان میں داخل ہوں گے تو ایک جنت کا منظر ہوگا، ہر طرف آرام ہوگا، خوشحالی ہوگی اور ہم غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔ اِنہی میں سے ایک گھرانہ ممتاز علوی کا بھی تھا، ممتاز علوی کے والد وکیل تھے جالندھر میں دیوی، طالب مندر کے نزدیک Reru کے محلے میں رہتے تھے اور بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ ممتاز علوی اور اُن کے گھرانے نے جالندھر سے لاہور ہجرت کا فیصلہ کرلیا، اُن سب نے جب ہجرت شروع کی تو ہجرت دونوں طرف سے شروع ہوئی تھی، اِدھر کے ہندو دہلی، امرتسر، گرداس پور، جالندھر، بھگواڑا، لدھیانہ اور فیروز پور، جانے کیلئے بے چین تھے جب کہ انڈین مسلم زیادہ تر لاہور جانا چاہتے تھے۔ اُن کا مین مقصد یہی تھا کہ خیریت سے لاہور پہنچ جائیں مگر جب تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو خاص طور پر مشرقی پنجاب میں قتل وغارت گری شروع ہوگئی۔ ہندوؤں کے اُکسانے پر سکھوں نے کرپانیں نکال لیں اور بے گناہ مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، ماؤں بیٹیوں کی عزتیں لوٹنے لگ گئے، جو مہاجروں کی ٹرینیں دہلی سے لاہور کیلئے آتیں اُنھیں راستے میں ہی لوٹ لیا جاتا، مسلمانوں کو قتل کیا جاتا اُن کی بیٹیوں کو اغواء کرلیا جاتا۔ یہی سلسلہ مغربی پنجاب میں بھی شروع ہو چکا تھا، مسلمانوں نے ہندوؤں اور

سکھوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا اور لوٹ مار بھی شروع کر دی تھی۔ ایسے سخت اور خطرناک حالات میں ممتاز علوی کے والد صاحب جو حمید علوی ایڈووکیٹ کے نام سے جانے جاتے تھے، نے طے کیا کہ ہم بھی جالندھر سے لاہور کے لئے نکلتے ہیں، مگر حالات بڑے سنگین تھے، گلی محلوں میں جگہ جگہ لوٹ مار توڑ پھوڑ اور قتل وغارت کا سلسلہ جاری تھا۔ حمید ایڈووکیٹ صاحب نے اپنے محلے کے چند لوگوں کو جمع کیا جو کہ Reru میں رہتے تھے، کچھ لوگ نور پور سے بھی شامل ہو گئے، اِن لوگوں نے ایک ٹرک کرائے پر لیا، اُس میں اپنا ضروری سامان رکھا، بچوں کو بٹھایا، چند محلے دار بیبیوں اور اُن کے گھر والوں کو ساتھ لیا اور رات کے اندھیرے میں جالندھر سے امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب یہ لوگ لدھیانہ سے نکل رہے تھے تو اِن کا ایک پالتو کُتا، جرمن شیفرڈ جس کا نام ایڈووکیٹ حمید صاحب نے ''کلائیو'' رکھا ہوا تھا اُس کو جالندھر میں ہی اپنے محلے Reru میں چھوڑ دیا۔ جب ٹرک وہاں سے نکلا تو اِن کے پالتو کتے نے ٹرک کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا، کتے کو ممتاز علوی نے بہت شوق سے پالا تھا، جب ممتاز نے دیکھا کہ کُتا ٹرک کیساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے تو ممتاز نے اپنے ابا سے کہا کُتے کو بھی ٹرک میں بیٹھا لیتے ہیں ساتھ لے چلتے ہیں۔ مگر حمید ایڈووکیٹ نے بڑے غصے میں کہا نہیں ممتاز، اپنی جان بچاؤ تمہیں کتے کی پڑی ہے، حمید کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو آ گئے وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کُتا تو وفادار جانور ہوتا ہے وہ اپنی وفاداری کا ثبوت بھی دے رہا ہے، مگر میں جو کہ انسان ہوں اور اشرف المخلوقات میں سے ہوں اس مشکل وقت میں اپنے وفادار کُتے کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ ممتاز نے پھر ایک دفعہ کوشش کی ٹرک ڈرائیور کو آواز دی اُستاد جی ٹرک رو کیے گا کچھ سامان رہ گیا ہے ٹرک رو کیے گا، وہ لینا ہے مگر ممتاز کے بڑے بھائی نے اُسے ڈانٹ کے منع کیا۔ ہوش کرو ممتاز کیسی باتیں کرتے ہو، اتنے میں ٹرک جو کافی پرانے ماڈل کا تھا، شاید دوسری جنگ عظیم میں فوجیوں کے استعمال میں رہا تھا، جالندھر سے کافی آگے آ چکا تھا، ممتاز کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو منڈلا رہے تھے۔ راستے میں کافی جگہ پر ٹرک کو روکا گیا بلوائیوں نے ٹرک لوٹنے کی ایک دو دفعہ کوشش بھی کی مگر ممتاز کے والد حمید صاحب جو کہ بہت عقلمند تھے نے بڑی ہوشیاری سے بلوائیوں کو یہ باور کروا دیا، کہ ہم مسلمان نہیں ہندو ہیں اور جالندھر سے

امرتسر جارہے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہ لوگ جالندھر سے امرتسر پہنچے وہاں سے پھر یہ لوگ لاہور کے لئے روانہ ہو گئے، جب یہ لوگ لاہور کے بارڈر کے قریب پہنچے تو ممتاز کو بہت تیز بخار ہو چکا تھا اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں مگر اُس نے بات چیت کرنی چھوڑ دی تھی۔ اِن لوگوں کو لاہور پہنچ کر والٹن کیمپ میں ٹھہرا دیا گیا وہاں پر بے شمار لٹے پٹے خاندان رہائش پذیر تھے جو ہجرت سے پہلے اپنے گھروں میں باعزت زندگیاں گزار رہے تھے، خوشحال تھے اور یہاں آ کر پاکستان میں جسے کہ ایک نعرے پر حاصل کیا گیا تھا ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ اللہ، لے کر رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان'' وہ پاکستان اب بن چکا تھا مالی، جانی اور اپنی ماؤں، بیٹیوں کی عزتوں کی قربانیاں دینے کے بعد یہ لوگ پریشان تھے نہ اِن کے پاس روٹی تھی نہ چھت تھا نہ کوئی کاروبار۔ حمید ایڈووکیٹ صاحب اور اُن کا خاندان جب جالندھر سے چلے تھے تو بڑے پرعزم اور پراُمید تھے کہ ہم امرتسر سے جب واہگہ کا بارڈر پار کریں گے تو جنت میں ہوں گے، اُن کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے، ممتاز ابھی تک اپنے وفادار کُتے کو ٹرک کے ساتھ بھاگتا ہوا محسوس کر رہا تھا، اُس کو اِس واقعہ کا اتنا شدید ذہنی اثر ہوا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا وہ بار بار ایک ہی بات دہراتا تھا، میں بے وفا، میں بے وفا، میں بے وفا۔ اُس کی بے بسی نے اُسے ذہنی توازن کھونے پر مجبور کر دیا تھا، ممتاز کو پاکستان بننے کی قیمت یوں چکانا پڑی کہ وہ والٹن کیمپ میں ''ممتاز پاگل'' کے نام سے جانا جانے لگا ۔۔۔۔۔

چندہ

مسجد میں مولوی صاحب کی تقریر بڑے غور سے سُنا کرتے تقریر ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب اعلان کرتے کہ آج ''چندہ'' آپ لوگوں نے زیادہ سے زیادہ دینا ہے کیونکہ مسجد کی بجلی کا بل زیادہ آیا ہے جو کہ 2275 روپے ہے، اور آجکل سردیاں ہیں اور سردیوں کے موسم میں گیزر چلتا ہے جس کی وجہ سے گیس کا بل بھی اس دفعہ پانچ ہزار چھ سو بیس روپے آیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب ساتھ ساتھ حکومت کو بُرا بھلا کہتے کہ دیکھیں کتنا ظلم کر رہی ہے حکومت لوگوں پر عام آدمی پر، حتیٰ کہ اللہ کے گھروں پر جہاں کہ بجلی اور گیس فری ہونی چاہیے، مگر اُنھیں بھی کمرشل ریٹس پر بل بھیجے جاتے ہیں۔ اتنے میں دو افراد اُٹھتے اور مولوی صاحب سے ایک کپڑا لیتے اور جھولی بنا کر مسجد میں بیٹھے تمام نمازیوں کے آگے جھولی پھیرتے، کوئی اُس میں دو روپے ڈالتا، کوئی پانچ، کوئی دس اور میں اکثر جمعے کی نماز میں پچھلی صفوں میں بیٹھ کو یہ مشاہدہ کر رہا ہوتا کہ لوگ اللہ کے گھر میں اللہ کے نام پر اتنی کنجوسی سے کیوں پیسے نکالتے ہیں اپنی جیبوں سے، کچھ لوگ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے کا نوٹ نیچے کر لیتے اور دس روپے کا نوٹ نکال کر جھولی میں ڈال دیتے اور ایسا محسوس کرتے کہ جیسے اُنھوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی ہو۔ میرے ابا جی بھی اس معاملے میں کافی کنجوس ثابت ہوئے تھے، وہ اکثر گھر ہی سے ایک روپیہ یا کبھی دو روپے یا بہت ہی زیادہ ہوتا تو پانچ روپے کا نوٹ مسجد کی جھولی میں ڈال دیتے، کچھ لوگ تو سکے تک ڈال دیا کرتے تھے، اور یہ سلسلہ کئی برسوں سے اسی طرح سے ہمارے محلے کی مسجد میں اور تقریباً ہمارے قصبے کی تمام مسجدوں میں یوں ہی چلتا رہتا۔ ہر مسجد کے اندر ایک گلہ بھی پڑا ہوتا تھا جس کو تالہ لگا ہوتا تھا اُس میں بھی کچھ نمازی جمعے کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے، نماز ختم ہونے کے بعد

مولوی صاحب اور مسجد کی کمیٹی کے ممبران بیٹھ کر وہ چندہ گناہ کرتے تھے، سکے علیحدہ کئے جاتے تھے روپے روپے کے نوٹ علیحدہ، دو دو روپے کے نوٹ علیحدہ، اسی طرح پانچ دس کے نوٹ علیحدہ، کوئی ایک دو پچاس کا نوٹ اور کبھی کبھی سو کا نوٹ بھی چندے میں سے مل جایا کرتا تھا۔

مولوی صاحب سے چابی لے کر گلہ کھولا جاتا تھا اُس میں سے جو پیسے نکالے جاتے تھے اُنھیں بھی گنا جاتا تھا اور تقریباً یہ ہر جمعے چندے کی رقم، چھ سات سو روپے سے زیادہ نہیں بن پاتی تھی۔ اس طرح چار جمعوں کا چندہ اگر جمع کیا جاتا کبھی کبھی مہینے میں پانچ جمعے بھی ہو جایا کرتے تھے تو چندہ بمشکل تین ہزار پینتیس سو یا کبھی کبھی بیالیس سو تک بن جایا کرتا تھا جس میں بمشکل بجلی اور گیس کا بل ہی پورا کیا جاتا تھا جبکہ خادم اور مولوی صاحب کی تنخواہ کمیٹی کے اراکین اپنی جیب سے، پیسے جمع کر کے ادا کیا کرتے تھے۔ میں یہ سلسلہ بچپن سے دیکھ رہا تھا جب بھی فجر کی اذان کا وقت ہوتا مولوی صاحب مسجد کا سپیکر آن کر کے پہلے درود شریف پڑھتے اس کے بعد اذان فجر دیا کرتے، پھر سپیکر پر ہی کھڑے ہو کر بچوں اور ہمسایوں کو آوازیں دیتے، سکندر، گل بادشاہ، راشد، اُٹھو بھئی فجر کا ٹائم ہو گیا ہے، جلدی کرو دیر مت کرو۔ یہ آوازیں سُن کر ہماری ماں ہمیں اُٹھایا کرتیں زبردستی اُٹھو دیکھو مولوی صاحب بُلا رہے ہیں، فجر کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔ مگر ہم بہانہ بناتے امی جی ابھی اُٹھتا ہوں، ابھی ٹائم ہے جی، آپ اتنی جلدی اُٹھا دیتی ہیں، سردی ہے مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے، میں نے نہیں جانا نماز پڑھنے، ایسی باتیں کرنے پر، ہمیں اپنی ماں سے لعن طعن سننی پڑتی مگر ہم بڑے ڈھیٹ ہوا کرتے تھے کبھی مہینے دو مہینے بعد فجر کی نماز پڑھنے چلے جایا کرتے تھے، نماز کی جماعت میں بمشکل آٹھ سے دس افراد فجر کے وقت با جماعت نماز ادا کیا کرتے تھے، اُن میں بھی زیادہ تر بزرگ ہوا کرتے تھے، پتہ نہیں یہ کیا ماجرا ہے کہ جب بھی مسجد سے کانوں میں اذان کی آواز آتی ہے تو ہم لوگ اُس پر دھیان نہیں دیتے۔ رب تعالیٰ کہتا ہے آؤ نماز کی طرف آؤ، آؤ فلاح پانے کے لئے آؤ، مگر ہم ایسے سنگدل اور سخت دل ہو چکے ہیں کہ ہمیں اذان کی آواز اب ایک روٹین سی لگتی ہے کہ بس ٹھیک ہے اذان ہو گئی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ ہم نماز پڑھیں۔ یہ رویہ تقریباً ہمارے پورے معاشرے میں پھیل چکا ہے جس کی وجہ سے ہمارے گھروں میں برکتیں ختم ہو گئی

ہیں، نہ ہمارے گھروں میں رزق کی برکت ہے نہ علم کی، نہ خیر کی برکت ہے۔ بس ہمارے چاروں طرف شیطان کا غلبہ ہے، وہ ہمیں بہانے بہانے سے خیر سے دور کر رہا ہے بلکہ ہم لوگ خیر سے بہت دور ہو گئے ہیں اور شر کی طرف بڑی خوشی سے بڑھ رہے ہیں حالانکہ رب ہمیں روزانہ پانچ دفعہ آوازیں دیتا ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر وہ ہمیں اپنی طرف بلاتا ہے مگر ہمارے دل ہیں کہ شاید اُن پر مہریں لگ چکی ہیں ہم خیر بھول رہے ہیں۔

عشاء کی اذان پھر ہو گئی ہے اور مولوی صاحب ہمیں بُلا رہے ہیں، مگر شاید میں آج پھر نماز عشاء نہ پڑھ سکوں کیونکہ میں نے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، میں نے اُس سے ٹائم لیا ہوا ہے اور وہ ٹائم بہت ضروری ہے، جب کہ میرا رب مجھے پانچ دفعہ روزانہ بلاتا ہے مگر میں اپنے رب کو ٹائم نہیں دے پا رہا، میں کتنا بڑا گناہ گار ہوں۔ آپ سب بھی اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کتنی نمازیں دن میں پڑھتے ہیں؟ اگر پڑھتے ہیں تو کیا ہم خیر کا کام کرتے ہیں کہ شر کا؟ نماز پڑھنے کے بعد میرے خیال میں کوئی ایسا عمل انسان کو نہیں کرنا چاہیے جو کہ اُسے گناہ کی طرف لے جاتا ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ہر فرد نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، دن میں ایک آدھ، دو تین اور کچھ پانچ نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر پھر بھی گناہ کرنے سے باز نہیں آتے، رشوت لینے سے باز نہیں آتے، اپنے بھائیوں کو نقصان دینے سے باز نہیں آتے، دفتروں میں مصلے رکھے ہوتے ہیں مگر اپنے جونیئرز کے لئے آسانیاں پیدا نہیں کرتے، اُنھیں تکالیف دینے کا سوچتے رہتے ہیں۔

یہ کیسا معاشرہ ہے، یہ کیسے لوگ ہیں کہ دین کے ساتھ منافقت کرتے ہیں۔ آیئے، ایک دفعہ پھر ہم اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ اللہ ہمیں سیدھے راستے پر رکھے۔ اُن لوگوں کے راستے پر نہ رکھے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں بلکہ ہمیں اُن لوگوں کے راستے پر رکھے جو کہ ایمان کا راستہ ہو، جو کہ سیدھا راستہ ہو، جس میں منافقت نہ ہو، جس میں خیر ہی خیر ہو۔۔۔۔

چوری

ساری رات وہ کھانستا رہا، اُس کی کھانسی بڑی شدید تھی، کبھی کوئی تین چار سانسوں کا وقفہ بیچ میں آتا تو پھر ایک نہ رکنے والی کھانسی شروع ہو جاتی، کھانستے کھانستے اُس کا بُرا حال ہو جاتا اور اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا، ہائے اللہ جی ہائے اللہ جی، میں مر گیا۔ میں جو کہ اُس کے ساتھ والے کمرے میں سویا ہوا تھا، رات کو جب بھی میری آنکھ کھلی اُسے کھانستے ہوئے سُنا پھر ایک آدھ بار اُس کو واش روم جاتے ہوئے، اُس کے قدموں کی آہٹ سے پہچانا، میرے دل میں اُس کے لئے بڑی ہمدردی تھی، رحم تھا، پر نا جانے کیوں میں رات اُس کے ساتھ اُٹھ کر جاگنا نہیں چاہتا تھا۔ دل ہی دل میں، میں اُس کے لئے دُعا مانگ رہا تھا اللہ پاک احسن کو صحت دیدے یہ کیسی بیماری اسے لاحق ہوگئی ہے، پورے پانچ دن ہو گئے تھے کہ وہ بستر سے نہیں اُٹھ پایا تھا، اپنے محلے کے ڈاکٹر سے دو تین دفعہ چیک بھی کروا چکا تھا اور ڈاکٹر نے دوائیاں بھی تبدیل کیں تھیں مگر اُسے کوئی پل چین نہیں تھا آرام نہیں تھا، مگر جب صبح آتی تو وہ خراٹے بھر رہا ہوتا اور پُر سکون نیند سو رہا ہوتا تو میں شکر کرتا کہ چلو تھوڑا ٹِک گیا ہے۔ میں آرام سے اُٹھ کر اپنا ناشتہ خود بناتا اور تیار ہو کر دفتر کے لئے نکل پڑتا، دفتر جا کر اپنی روٹین کا کام شروع کرتا دوستوں یاروں اور کولیگز کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتا۔ شام پانچ بجے جب میں میٹرو میں بیٹھ کر اپنے سٹاپ پر اُترتا تو مجھے سٹاپ سے گھر پہنچنے تک پندرہ منٹ لگ جاتے تقریباً اُس وقت مغرب کا وقت ہو چکا ہوتا، جب میں اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہوتا تو مجھے احسن کی کھانسی کی آواز آنا شروع ہو جاتی، مجھے فلیٹ میں داخل ہوتا دیکھ کر احسن کہتا، تو دفتر سے آگیا، تو میں کہتا احسن سُنا کیا حال ہے؟ دوائی لی تھی کچھ کھانا کھایا ہے کہ کچھ نہیں لیا؟ تو وہ بڑی بے چارگی کے ساتھ کمرے کی چھت کی طرف گھورنا شروع کر دیتا اور نا جانے کن خیالوں میں کھو جاتا، میں اُسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھتا پھر بھی اُس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر پوچھتا، احسن یار بتا تو صحیح، تمھیں کیا روگ ہے، کیا غم ہے۔ وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے اپنے بستر کے سرہانے کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبی نکالتا، سگریٹ سلگاتا اور ایک لمبا کش لگانے کی کوشش کرتا مگر اُس کی کھانسی

آڑے آجاتی اور وہ لگاتار کھانسنے لگ جاتا۔ میں اُسے قریب پڑے ہوئے گلاس میں سے پانی ڈال کر دیتا اور وہ چند گھونٹ پانی پی کر تھوڑی دیر کے لئے پُرسکون ہو جاتا، میں نے احسن سے کہا یار تو گاؤں چلا جا، تیری بیماری بڑھتی چلی جا رہی ہے اور تیرا علاج بھی کوئی ٹھیک طریقے سے یہاں نہیں ہو رہا، کم از کم گاؤں میں تم اپنوں کے پاس تو رہو گے۔ وہ ایک بے معنی ہنسی ہنستا اُس کے چہرے پر ایک یاسیت پھیل جاتی، رنگت اُس کی پیلی پڑ چکی تھی اور کلائیاں بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ میں نے اُسے پوچھا کل صبح کا ٹکٹ کروا دوں، ٹرین کا جو تیرے گاؤں سے گزرتی ہے۔ تو احسن تھوڑا پریشان سا ہو کر بولا کیا تو مجھ سے تنگ آ گیا ہے؟ یار تم تو ایسے نہیں تھے ہم نے بچپن ساتھ گزارا ہے، کنچے اکٹھے کھیلے ہیں، گلی ڈنڈا کھیلا ہے، بندر کلا ساتھ میں کھیلا ہے، یار ایک ہی سکول میں گاؤں میں اکٹھے پڑھے ہیں اور تجھے یاد نہیں ہے، وہ جو وڑنچوں کی بیٹی تھی بہت خوبصورت نازک سی جب ہم سکول جایا کرتے تھے، سائیکل پر تو وہ تانگے میں بیٹھ کر کالج جایا کرتی تھی اور تجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں کو وہ بہت پیاری لگتی تھی، مگر میں نے یاری میں آ کر اُس پر سے اپنا حق ختم کر لیا تھا اور کہا تھا کہ، جاوید آج سے یہ تیری ہوئی۔ وہ ہنسنے لگا، اور کمال دیکھ کہ وہ ہم دونوں کی ہی نہ ہو پائی، ہم ٹھہرے غریب لوگوں کے بچے، وہ چوہدرین تھی، اُس نے تو کسی بڑے جاگیردار کے گھر بیاہے جانا تھا نہ، مگر آج تک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں یاد ہیں جو کہ دیکھنے پر ہر وقت مسکراتی رہتی تھیں اور ہم دونوں کو شک پڑتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پھنسی ہے، جو کہ سب کہتے ہیں جو ہنسی وہ پھنسی۔

پھر تو کالج پڑھنے شہر چلا گیا اور میں وہیں گاؤں میں رہ گیا، تیرا باپ تو چھوٹا موٹا کسان تھا اور اُن کے پاس اتنی مالی سکت تھی کہ وہ تمھیں میٹرک کے بعد کالج کی پڑھائی کے لئے شہر بھیج سکتے تھے، مگر میرا باپ جس کی کے جوتوں کی دُکان تھی اور وہ بھی ایک چھوٹے سے گاؤں میں اُس کے پاس نئے جوتے بنانے کے آرڈر تو بہت کم آتے تھے، ہاں مگر مرمت والی جوتیاں بہت زیادہ آجایا کرتی تھیں جن کو مرمت کر کے ہمارا باپ ہم دو بہن بھائی اور ماں کا پیٹ پالتا تھا۔ پھر اچانک ایک دن میرا باپ شدید گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت اپنی دکان پر کام کرتے ہوئے، دل کا شدید دورہ

پڑنے سے فوت ہوگیا۔اُس کے جانے کے بعد میں گھر میں سب سے بڑا تھا، میں نے باپ کی دُکان سنبھال لی مگر میرے پاس لوگ کام لے کر نہیں آتے تھے۔جو میرے باپ کے پرانے گاہک تھے اُنھوں نے آہستہ آہستہ آنا کم کر دیا ہمارے گھر کا خرچہ چلنا دُشوار ہوگیا، میں نے دُکان چھوڑ کر مزدوری کرنی شروع کر دی۔ایک دن مزدوری کرتے ہوئے میرا پاؤں پھسلا اور میرے سر پر شدید چوٹیں آئیں، مجھے اُٹھا کر گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری لے جایا گیا وہاں پر موجود ڈسپنسر نے مجھے دو ٹیکے لگائے، سر پر گہری چوٹ آئی تھی وہاں پر ٹانکے لگا دیئے اور پٹی کر کے مجھے گھر بھیج دیا گیا۔جب میں گھر پہنچا تو میری ماں اور بہن پریشان ہوگئیں، کہ احسن یہ کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ نہیں بس تھوڑی سی چوٹ لگی ہے، پھر کچھ دن کے لئے میں مزدوری کرنے سے بھی معذور ہوگیا، اِس دوران میری ماں نے چوہدری کے گھر نوکری کر لی، وہ روز صبح چوہدری کے گھر چلی جاتی اُن کا سارا کام کاج ہانڈی پکانا، کپڑے دھونا، صفائیاں کرنا اور بازار کے سارے کام اپنے ذمہ لے لئے اِس کے جواب میں میری ماں وہاں سے روز شام کو ہمارے لئے بچا کُھچا کھانا لے آتی، چوہدری کی بیوی میری ماں کو اپنے اور اپنے بچوں کے پُرانے کپڑے دیدیا کرتی جو ہم لوگ پہن کر گزارا کرتے تھے، گرمیوں میں گرمیوں کے کپڑے اور سردیوں میں گرم کپڑے۔میری ماں گاؤں کے بازار میں جب سردیوں میں لنڈے کا مال آتا تو ہمارے لئے وہاں سے جوتے اور گرم سوئٹر وغیرہ بھی خرید لاتی اور بڑی خوش ہوتی کہ دیکھ احسن کتنا سوہنا ہے، ایسے لگتا ہے کہ اِس سوئٹر کو کسی انگریز نے ہاتھ ہی نہیں لگایا بالکل نیا ہے اور یہ رنگ تجھے بہت جچے گا۔

ایک دن میری ماں کو بخار تھا، اُس دن وہ چوہدری کے گھر کام پر نہ جا سکی اُس نے میری بڑی بہن کو چوہدری کے گھر بھیج دیا، میری بہن جانا نہیں چاہتی تھی اُسے شرم آتی تھی یا پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ ماں سے ضد کر رہی تھی کہ اماں میں نہیں جانا، مگر میری ماں نے اُسے سمجھایا کہ پُتر بھائی بیمار پڑا ہے مجھے سخت بُخار ہے بس ایک دن کے لئے چلی جا کل پھر سے میں چلی جایا کروں گی۔

پھر میری بہن چوہدری کی حویلی چلی گئی، شام کو ہشاش بشاش واپس لوٹی، اُس کے ہاتھوں میں تازہ کھانا تھا اور گرم گرم روٹیاں۔میری ماں چونکی اور اُس نے کہا پتر کیا تو چوہدری صاحب کے گھر سے

اُن کے کھانے کا سارا سامان اُٹھا لائی ہے؟ تو بہن (پینو) نے کہا، نہیں اماں یہ تو مجھے چوہدری صاحب نے خود کہا تھا کہ یہ کھانا اپنی ماں کے لئے اور اپنے بھائی کے لئے لے جا، اماں وہ لوگ تو بڑے اچھے ہیں، اتنی بڑی حویلی ہے، اتنے بڑے برآمدے ہیں، اتنے کمرے ہیں، اماں تو تھکتی نہیں اتنا کام کر کے؟ ماں نے پوچھا، تو آج تھکی ہے؟ اُس نے کہا، نہیں اماں میں تو نہیں تھکی۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی جوانی مجھے نظر آ رہی تھی جو مجھے خوف دلا رہی تھی، میں اندر سے کانپ گیا مگر کچھ بول نہ سکا۔ پھر کیا تھا، پینو روز حویلی جانا شروع ہو گئی، خوشی خوشی اور یہ بات مجھے اور زیادہ حیران کرتی تھی کہ پہلی دفعہ تو پینو حویلی جاتے ہوئے رو رہی تھی ڈر رہی تھی مگر اب اچانک یہ کیسی تبدیلی؟

میرے دل میں بُرے بُرے خیال آتے کہ کہیں چوہدری کا بیٹا تو کہیں پینو کو پسند نہیں آ گیا، کہیں پینو نے اُسے دل نہ دے دیا ہو، پھر میں اپنے آپ پر شرمندہ ہوتا خود کو گالیاں دیتا کہ بے غیرت انسان اپنی بہن کے بارے میں کیسی باتیں سوچتا ہے، کچھ شرم کر، کچھ حیا کر، مگر میرے دل کا چور مجھے ہر روز ڈراتا۔ دِن گزرتے رہے دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے، اور ایک دن پینو اچانک گھر میں چکرا کر گر پڑی۔ ماں نے فوری طور پر ہمسائی کو بلایا اور اُسے کہا، سکینہ دیکھ یہ پینو کو کیا ہو گیا ہے غسل خانے تک گئی تھی واپس آئی ہے اور دھڑام سے گر گئی ہے۔ ماسی سکینہ نے کہا، زینب فکر نہ کرو ویسے ہی آجکل موسم تبدیل ہو رہا ہے اِس موسم میں اکثر گرمی کی وجہ سے چکر آ جاتا ہے، اور کچھ حویلی میں اُلٹا سیدھا کھا لیا ہو گا جس کی وجہ سے اِس کو اُلٹیاں لگ گئی ہیں ایسا کر اِسے کالی پتی کا کاہوا بنا کر دے اللہ خیر کرے گا شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔

ہمارا گھر صرف دو کمروں کا گھر تھا، وہ بھی چھوٹے چھوٹے، درمیان میں چھوٹا سا صحن تھا صحن کے دائیں جانب باورچی خانہ اور بائیں جانب غسل خانہ تھا، صحن اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اتنے میں، میں گھر آ گیا اور پوچھا، ماں پینو گھر آ گئی ہے؟ ماں نے کہا، نہیں پتر آج تو وہ گئی ہی نہیں۔ میں نے کہا کیوں خیر ہو۔ ماں نے بتایا کہ آج اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے چکر آ رہے ہیں اُٹھ کر جب بھی بیٹھتی ہے تو اُلٹی کر دیتی ہے، محلے کے ڈسپنسر سے دوائی بھی لے کر آئی ہوں، وہ کہتا ہے کوئی نہیں

ایک دوخوراک لے گی ٹھیک ہو جائے گی اُس نے ہاضمے کا لال رنگ کا مکسچر بھی دیا ہے، انشاء اللہ وہ کہتا ہے کہ کل تک پینو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

میں خاموشی سے جا کر پینو کی چارپائی پر بیٹھ گیا، پینو نے جب سے حویلی جانا شروع کیا تھا اُس کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی، جو فاقہ زدہ زندگی ہمارے ساتھ گزار رہی تھی حویلی میں کام کرنے سے اُس کی رنگت میں فرق پڑ گیا تھا اُس کا وجود بھی بھاری ہو گیا تھا۔ میں نے پینو کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا، پتر کیا حال ہے، طبیعت زیادہ تو نہیں خراب؟ اُس نے کہا، نہیں پاہ جی میں ٹھیک ہوں اماں ایسی ہی فکر کرتی رہتی ہے صبح تک بھلی چنگی ہو جاؤں گی آپ سوئے ہو گے تو میں حویلی کام کے لئے چلی جاؤں گی دیکھنا۔ اتنے میں اماں آ گئیں، اماں نے کہا، چل شودی آرام سے اب سوسارا دن کا میرا جینا حرام کیا ہوا ہے اب بھائی آیا ہے تو بھائی کے ساتھ لاڈے مائیاں کر رہی ہے۔ میں خاموشی سے اُٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا مگر پھر آدھی رات کے وقت میری اچانک آنکھ کھلی، جاوید میرے اندر کا چور مجھے کہہ رہا تھا کہ چوری ہو گئی ہے مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ جب صبح اُٹھا تو ماں نے مجھے چائے بنا کر دی۔ میں نے پوچھا کہ پینو حویلی چلی گئی ہے؟ ماں نے کہا ہاں پتر مجھے ٹھیک لگتی تو نہیں تھی مگر وہ بضد تھی کہ میں نے کام پر جانا ہے۔

احسن اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا، اور میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح احسن کو ہر حال میں اس کے گاؤں واپس بھیج دوں گا مگر احسن کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا۔ جاوید اُس دن جب میں شام کو مزدوری کر کے گھر واپس آ رہا تھا تو ایک بہت زیادہ بھیڑ میں نے اپنی گلی میں دیکھی ایسے لگتا تھا کہ سارا گاؤں میرے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ میں نے ایک بچے سے پوچھا، کہ بیٹا یہ رش کیوں لگا ہوا ہے؟ اُس بچے نے کہا کہ چاچی جینا کی بیٹی بچے کی ماں بننے والی ہے۔ جاوید وہ دن اور آج کا دن میں اپنے گھر اور اپنے گاؤں سے نکل آیا میرا ڈر سچ ثابت ہوا کیونکہ چوری ہو چکی تھی۔ یہ کہتے ہوئے احسن پھر کھانسنے لگ پڑا کھانستے کھانستے اُس کا سانس اُکھڑ گیا۔ میں اُسے فوری طور پر شہر کے سرکاری ہسپتال کی ایمرجنسی میں لے گیا، دس روپے کی پرچی بنوائی، احسن کو ایمرجنسی وارڈ میں ایک بستر پر لٹا دیا گیا، ڈیوٹی ڈاکٹر آیا، اُس نے احسن کا طبی معائنہ کیا،

کچھ دوائیاں لکھیں کچھ ٹیسٹ لکھے اور ایکسرے کا کہا اور جاتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ ٹیسٹ اور ایکسرے تو ہسپتال سے ہو جائیں گا، ہاں یہ ٹیکے اور دوائیاں آپ باہر سے لے آئیں۔ میں نے جلدی سے وہ دوائیوں والی پرچی پکڑی اور ہسپتال سے باہر نکل گیا، جب میں واپس آیا تو وارڈ بوائے احسن کا ایکسرے کروانے لے کر گئے ہوئے تھے، چونکہ ڈاکٹر نے اُس کی چھاتی کا ایکسرے کروانے کا کہا تھا اور باقی خون کے ٹیسٹ تھے جن کی رپورٹ صبح ملنی تھی۔ اتنے میں احسن کو وارڈ بوائے ویل چیئر پر لے کر واپس ایمرجنسی بیڈ پر لٹا گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ بھائی ایکسرے کی رپورٹ کب ملے گی؟ اُس نے کہا گھنٹہ لگ جائے گا، احسن پھر کھانسنے لگ پڑا اُس کا سانس پھر اُکھڑ گیا۔ میں نے بھاگ کر ڈیوٹی پر موجود سٹاف سے کہا، پلیز آ کر ذرا 12 نمبر بیڈ والے مریض کو دیکھ لیں۔ سٹاف بڑے اطمینان سے بولی، آپ جائیے میں آتی ہوں۔ اُس کے آنے تک احسن کا سانس اور زیادہ پھول چکا تھا۔ اُس نے آتے ہی وارڈ بوائے سے کہا کہ بیڈ نمبر 12 کے مریض کو آکسیجن لگا دو، وارڈ بوائے نے فوری طور پر آکسیجن کا سلنڈر آن کر کے چیک کیا اور آکسیجن والا ماسک احسن کے ناک پر رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد احسن کی طبیعت تھوڑی بحال ہوئی۔ میں نے اُسے کہا اب تو بھلا چنگا ہو کر اپنے گھر اور گاؤں واپس جائے گا بس، اگر تو میرا یار ہے تو۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آ گئی پھر احسن کو ایمرجنسی وارڈ سے جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا، رات کافی ہو چکی تھی مجھے احسن نے اشارے سے کہا، تم اب گھر جاؤ۔ مگر میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پھر مجھے جنرل وارڈ میں موجود سٹاف نے کہا آپ گھر جائیں کوئی بات نہیں مریض کی حالت اب بہتر ہے اور خطرے سے باہر ہے۔ میں نے احسن کا ہاتھ پکڑا، دبایا اور آنکھوں آنکھوں میں اُسے کہا کہ اللہ خیر کرے گا۔ مگر میرے اندر کا ''چور'' کہہ رہا تھا کہ ''چوری'' ہو گئی ہے میں تھکے ہارے جسم کے ساتھ واپس اپنے فلیٹ پر آ گیا، صبح جب میں اُٹھا تو دفتر جانے کی بجائے سرکاری ہسپتال کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں جنرل وارڈ میں پہنچا تھا کہ سٹریچر پر کسی مریض کو چادر میں لپیٹے ہوئے وارڈ بوائے لے کر جا رہے تھے، میں جب احسن کے بیڈ کے قریب پہنچا تو بیڈ خالی تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بلے بلے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایک ایسا تاریخی ادارہ اور درسگاہ ہے جس نے برصغیر پاک و ہند میں اپنے تعلیمی معیار کو انتہائی بلند رکھا، اس عظیم درسگاہ سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوانوں نے پورے برصغیر میں اور برصغیر سے باہر بھی اپنی اپنی درسگاہ کا نام بلند رکھا۔ یہ وہی درسگاہ ہے جس کے نوجوانوں نے تحریک پاکستان میں قائداعظمؒ کے کہنے پر تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد جتنی بھی بیوروکریسی اور جتنے بھی اہم ادارے تھے اُن میں 80 فی صد افسران بالا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔

آج میں جس شخصیت کا آپ کے ساتھ ذکر کرنے جا رہا ہوں وہ اپنے اندر ایک بہت بڑی یونیورسٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ جناب سید فخر الدین بلے، مایۂ ناز ادیب شاعر دانشور، سکالر، محقق، کہنہ مشق صحافی، ماہر تعلقات عامہ، فنون و ثقافت کے دلدادہ اور امیر خسرو کے بعد نئے قول ترانے کے خالق اور اعلیٰ انسانی اقدار و روایات کے امین ایک تہذیبی شخصیت تھے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے کالم ''نکار خانے'' میں لکھا ''وہ محض ایک شخصیت نہیں، ایک ادارہ ایک آدرش، ایک انجمن بلکہ اپنی ذات میں ایک جہان تھے۔ تمام زندگی محبتیں بانٹیں، محبتیں سمیٹیں اور محبتیں لوٹائیں، ڈاکٹر وزیر آغا اور این میری شمل نے سید فخر الدین بلے کو تصوف پر اہم اتھارٹی قرار دیا۔ علامہ سید غلام شبیر بخاری علیگ نے بڑا تفصیلی سوانحی خاکہ لکھا کہ سید فخر الدین بلے نے اُردو انگریزی فارسی اور ہندی میں جو تالیفات ترتیب دیں اُن کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ اِن مطبوعات میں کتابیں، کتابچے، سووینئر، بروشرز بھی شامل ہیں، یہ تمام مختلف موضوعات پر ہیں جن سے سید

فخر الدین بلے کی وسعت علمی اور حب الوطنی کا پتا چلتا ہے۔ فیض احمد فیض سید فخر الدین بلے کو ''چھپا رستم'' کہتے تھے اور بقول احمد ندیم قاسمی وقت نے فیض صاحب کے اس تجزیئے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ جون ایلیا کہتے تھے سید فخر الدین بلے کی خوبصورت شاعری ان کی دلکش شخصیت کا پرتو ہے ۔ڈاکٹر انور سدید نے لکھا کہ وہ ادبی اور ثقافتی تنظیم ''قافلہ'' کے بانی بھی تھے جس کے پڑاو، لاہور میں اِن کے گھر پر دس برس تک بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہوتے رہے۔ اس قافلے کے پڑاوَ کی باز گشت ان کے ہفت روزہ جریدے ''آواز جرس'' میں بھی سُنائی دیتی تھی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کہتے تھے کہ سید فخر الدین بلے تو خود ایک قافلہ ہیں، ایک ایسا قافلہ جو سب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ملتان میں 25 روزہ جشن تمثیل کرانے پر سید فخر الدین بلے کو آرٹس اور تھیٹر کی دُنیا کے اکابرین نے ''محسن فن'' اور مین آف دا سٹیج کے خطاب سے بھی نوازا، اس کا اعلان اُن کے ساتھ ایک شام منا کر کیا گیا۔

پاک و ہند کے نامور ادیبوں اور ناقدوں نے اِن کی فکر، شخصیت اور فن کی بہت سی جہتوں کو اپنے مقالات اور نگارشات میں اُجاگر کیا ہے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اِن کے مضامین کو کتابی صورت میں یکجا کیا ہے جسے ''سید فخر الدین بلے۔۔ بلے بلے'' کا نام دیا گیا ہے یہ کتاب پڑھ کر ادب و ثقافت کی ایک مینار اقامت شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے آپ سے اِس شخصیت کی ملاقات کروانے کے لئے چند جھلکیاں قارئین کرام کی نذر ہیں۔۔

نامور ادیب شاعر اور دانشور افتخار عارف نے سید فخر الدین بلے، ایک فرد۔ ایک روایت کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ وہ ہمارے زمانے کے ان یگانہ روزگار شخصیات میں سے تھے کہ جن کی ذات گرامی بے شمار کمالات کا مجموعہ تھی شاعر ادیب، نقاد، محقق، سکالر۔ پروردگار عالم نے سید گرامی کو بہت نوازا تھا، شخصی طور پر وہ ایک انتہائی ملنسار خوش مزاج کشادہ ذہن، کشادہ نظر آدمی تھے کہ جو بھی اُن سے مل لیتا اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آلِ محمدؑ سے ان کی تمام و کمال عقیدت ان کے اشعار میں بھی ان کے دل کی ترجمانی کرتی نظر آتی تھی، آج بھی اِن کا کلام مودت و عقیدت کے ساتھ پڑھا اور پسند کیا جاتا ہے، اپنے اہل کمال کو یاد رکھنا اور اُن کی

خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کرنا زندہ قوموں کی روایات میں شامل ہوتا ہے۔ لازم آتا ہے کہ ہم سید فخرالدین بلے کی علمی و ادبی خدمات کو یاد رکھیں، سید فخرالدین بلے کا کلام سوچ کے در کھولتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بھری محفل میں کھل کر اعتراف کیا کہ سید فخرالدین بلے کے کلام میں دریا کی روانی اور جذبوں کی فراوانی ہے، تاریخ، ادب اور تصوف کا وسیع مطالعہ اِن کے کلام میں بولتا ہوا اور سوچ کے در کھولتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپ انھیں تصوف پر ایک اہم اتھارٹی قرار دے سکتے ہیں۔ نامور شاعر اور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا نے سید فخرالدین بلے کے سرگودھا سے لاہور تبادلے پر منائی جانے والی ایک شام میں اپنا ایک مضمون پڑھتے ہوئے کہا تھ کہ ''میرے لئے بلے صاحب کی ذات اور شخصیت کے دریا کو کوزے میں بند کرنا بہت مشکل ہے، وہ اتنے اچھے ہیں اتنے اچھے ہیں کہ بہت ہی اچھے ہیں، اور یہی شاید اِن کا قصور بھی ہے، جب مہاتما گاندھی کو گوڈسے نے گولی کا نشانہ بنایا تو جارج برنارڈ شا نے برملا کہا تھا۔ دیکھا اِس دُنیا میں اچھا ہونا کتنا خطرناک ہے۔ کچھ یہی بلے صاحب کا حال ہے اُنھوں نے زمانے سے جو زخم کھائے ہیں اس کی داستان طویل تو ہے لیکن لذیذ ہرگز بھی نہیں، البتہ اس میں قطعاً کوئی کمال نہیں کہ ان چرکوں نے وہی کام کیا جو گوڈسے کی گولی نے کیا تھا۔ اب غلام جیلانی اصغر چاہیں تو برملا کہہ سکتے ہیں کہ بلے صاحب میں نہ کہتا تھا کہ! اتنا اچھا ہونا اچھا نہیں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے مزید لکھا کہ ادب کے لئے بلے صاحب کی لگن اور لگاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے، قدرت نے اِنھیں اعلیٰ ذوق ہی عطا نہیں کیا ، دل کی باتوں کو لفظوں میں ڈھالنے کا گر بھی سکھایا، ان کی نثر اتنی پختہ، نین نقش کی اتنی صحیح اور لفظوں کے انتخاب کے معاملے میں اس قدر سخت مزاج کہ کسی فقرے پر تو کجا ان کے استعمال شدہ لفظ پر بھی اُنگلی رکھنا بہت مشکل ہے۔ اس پر ان کا وسیع مطالعہ ہے اُنھوں نے کتابوں کو خود پر لادا نہیں بلکہ ان کو ہضم کیا ہے، اور پھر ان کے مطالعہ کو اپنی سوچ سے ہم آہنگ کر کے بڑے خوبصورت انداز میں لفظوں کے حوالے کر دیا ہے۔ تصوف کے موضوع پر ان کی نظر اتنی گہری ہے کہ آج بلا تکلف انھیں اس سلسلے میں ایک اہم اتھارٹی قرار دے سکتے ہیں۔ بلے صاحب شاعر بھی بہت اچھے ہیں، شاعری کے بھی اُن کے ہاں دونوں رنگ ملتے ہیں، کلاسکی بھی اور جدید بھی۔۔

پینے والے تو ہمہ وقت پیا کرتے ہیں

رند بدمست کو پابندیٔ اوقات سے کیا

ہم نے اے دوست خودکشی کے لئے

آستینوں میں سانپ پالے ہیں

فراق گورکھپوری کے خیال میں سید فخر الدین بلے رنگوں کی بجائے، الفاظ سے تصویریں بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر خواجہ ذکریہ، اشفاق احمد، پیر حسام الدین راشدی، انتظار حسین، سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نصیر الاجتہادی، مرزا ادیب، پریشان خٹک، علامہ سعید احمد سعید کاظمی، ڈاکٹر اسلم انصاری، رئیس امروہوی، ڈاکٹر عنوان چشتی، احمد ندیم قاسمی اور جون ایلیا سمیت کس کس کا نام لوں، اور کس کس کو چھوڑ دوں جنھوں نے اس شخصیت کے کام اور کلام کو دیکھ کر اپنے اپنے انداز میں ''بلے بلے'' نہیں کہا

مکمل نام: سید فخر الدین محمد بلے

قلمی نام: سید فخر الدین بلے

تخلص اور عرفیت: بلے

ازل سے عالمِ وجود سے سفر کر کے تھکے تو جسم کے حجرے میں اعتکاف کیا، سید فخر الدین بلے بوقت صبح صادق عالم وجود میں آئے۔

تاریخ ولادت: 15 دسمبر 1930ء یہ تاریخ ولادت سرکاری دستاویزات کے مطابق ہے۔ اصل تاریخِ ولادت 06 اپریل 1930ء ہے دن اتوار مقام ولادت ہاپوڑ (میرٹھ) متحدہ ہندوستان عمر 73 سال 9 ماہ 22 دن یہ مدت عیسوی ماہ وسال کے اعتبار سے ہے، ہجری کیلینڈر کے اعتبار سے عمر 76 سال ایک ماہ بنتی ہے۔ بلے کی وجہ تسمیہ سلطان الہند غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اپنے صاحبزادے کا نام فخر الدین رکھا تھا، اور انھیں پیار سے بلے کہتے تھے اسی مناسبت سے آپ کے والد بزرگوار غلام معین الدین چشتی نے اپنے بیٹے کا نام فخر الدین رکھا اور

پیار سے ہمیشہ بلے کہہ کر پکارا۔ آپ کو بچپن میں ہی ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، جگر مراد آبادی، تلوق چند، علامہ نیاز فتح پوری، سیماب اکبرآبادی، مولانا عبدالسلام نیازی سمیت نامور قد آور شخصیات کی صحبتوں میں بیٹھنے اور فیض پانے کے مواقع ملے۔ امیر خسرو کے بعد سید فخر الدین بلے نے "نیا رنگ" لکھا، اور اس قول کو اس عہد کے بڑے بڑے جید علماء نے سید فخر الدین بلے کا "تخلیقی معجزہ" قرار دیا۔ سید فخر الدین بلے کے اس تاریخی کارنامے پر عراق، ایران، بھارت اور پاکستان سمیت کئی ملکوں میں تحقیقی کام جاری ہے سید فخر الدین بلے بہت بڑے تاریخی پس منظر کے مالک ہیں ان کی شخصیت ادب اور تاریخ میں بڑا مقام رکھتی ہے۔ آجکل ان کی تعلیمات اور تاریخی کارناموں کو ان کے صاحبزادے ظفر معین بلے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے میں لگے ہیں تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ان کے ادبی تاریخی اور تعلیمی کام سے فیض یاب ہوسکیں۔۔۔۔۔

بھیڑیا

قارئین کرام اکثر آپ لوگوں نے دیکھا اور پڑھا ہوگا کہ لوگ بہادری اور طاقت کے حوالے سے اپنے بچوں اور چاہنے والوں کو شیر کے ساتھ مشابہت دیتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے معاشرے میں یہ بات چلتی ہے کہ فلاں شخص بڑا ببر شیر ہے، یا پھر میرا بیٹا یا میرا بچہ شیر ہے۔ شیر کو بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

آج آپ سے بات کرنی ہے کہ بہت سے ممالک ایسے ہیں جنھوں نے اپنی بہادری کے اظہار کے لئے مختلف جانوروں کو علامت کے طور پر رکھا ہوا ہے، پاکستان نے مارخور اپنا قومی نشان رکھا ہے اور سری لنکا نے شیر کو قومی علامت کے طور پر رکھا ہوا ہے مگر آج جس قوم کے حوالے سے آپ کے ساتھ میں معلومات شیئر کرنے جارہا ہوں وہ ترک قوم ہے۔ ترک قوم بھیڑیئے کو اپنی بہادری کی علامت سمجھتی ہے، اگر آپ نے ڈرامہ ارطغرل دیکھا ہے تو اُس میں جو سفید داڑھی والے بزرگ آپ کو نظر آئیں گے، اُن کو بھی علامت کے طور پر بھیڑیئے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

آج آپ کو خاص طور پر یہ بتانے کے لئے یہ مضمون لکھ رہا ہوں کہ ترک قوم بھیڑیئے کو ہی اپنی قومی نشان کے طور پر استعمال کرتی ہے، اِس کی اصل حقیقت آپ کے ساتھ شیئر کرنے جارہا ہوں، کیا آپ جانتے ہیں کہ بھیڑیئے میں کیا کیا خوبیاں ہیں، سب سے پہلے کہ بھیڑیا اپنے والدین کا انتہائی وفادار ہوتا ہے، بڑھاپے میں والدین کی خدمت کرتا ہے، ایک غیرت مند جانور ہے اِسی لئے ترک قوم اپنی اولاد کو شیر کی بجائے بھیڑیئے سے زیادہ تشبیہہ دینا پسند کرتے ہیں۔ بھیڑیا واحد ایسا جانور ہے جو اپنی آزادی پر کبھی بھی سودے بازی نہیں کرتا کبھی کسی کا غلام نہیں بنتا بلکہ جس دن پکڑا جاتا ہے اُس دن سے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، اِس لئے اُس کو کبھی بھی آپ نے چڑیا گھروں میں بند یا قید نہیں دیکھا ہوگا۔ آپ نے چیتے، ہاتھی، شیر اور تمام جانوروں کو چڑیا گھروں کے پنجروں میں قید دیکھا ہوگا مگر بھیڑیا کبھی آپ کو چڑیا گھر میں نظر نہیں آتا۔

یہاں پر آپ کو ایک خاص بات بتاتا چلوں کہ بھیڑیا کبھی بھی مردار کھانا کھانا پسند نہیں کرتا یہی جنگل کے بادشاہ کا بھی طریقہ ہے۔ یہ باقی جانوروں سے بالکل مختلف ہے۔ بھیڑیا اپنی

ماں اور بہن کو کبھی بھی شہوت کی نگاہ سے دیکھتا تک نہیں، اپنی شریکِ حیات کا اتنا وفادار ہوتا ہے کہ کسی اور مؤنث سے تعلق قائم نہیں کرتا، اسی طرح مؤنث یعنی اُس کی شریک حیات بھیڑیئے کے ساتھ اُسی طرح سے وفاداری نبھاتی ہے، بھیڑیا اپنی اولاد کو بھی پہچانتا ہے، جوڑے میں سے اگر ایک مرجائے تو دوسرا اُس جگہ پر تین ماہ مسلسل کھڑا رہتا ہے، ماتم کے طور پر اور اُس کے جانے کا افسوس کرتا ہے۔ بھیڑیئے کو عربی زبان میں ابنالبار کہا جاتا ہے، یعنی ''نیک بیٹا'' کیونکہ جب اُس کے والدین بوڑھے ہوجاتے ہیں تو یہ اُن کیلئے شکار کرتا ہے اُن کا پورا خیال بھی رکھتا ہے، اسی لئے ترک اپنی اولاد کو شیر کی بجائے بھیڑیئے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق یہ بہتر ہے کہ شیر جیسا خونخوار بننے سے بہتر ہے کہ بھیڑیئے جیسا چالاک ہوشیار اور وفادار بنا جائے۔

اِس سارے مضمون اور ساری معلومات دینے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ کو یہ بتایا جائے کہ آج کے دور میں حضرت انسان جو کہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور رب نے اُس کو تمام مخلوقات پر افضل رکھا ہے، مگر نہایت افسوس سے یہ کہنا اور لکھنا پڑتا ہے کہ آج کا انسان امریکہ سے لے کر بھوٹان تک، اور نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک انتہائی تنزلی کا شکار ہو چکا ہے، نہ اُس کو رشتوں کا کوئی خیال ہے نہ اُس کو انسانیت کے جو اصول اور ضوابط بنائے گئے ہیں اُن کا احترام ہے۔ میرے نزدیک آج کے دور کا انسان جو قوانین اور ضابطے اپنے لئے بناتا ہے وہ جنگل کے قوانین سے بھی بدتر ہیں، جنگل کا قانون آج کے معاشرے کے قانون سے بہت بہتر ہے۔ بھیڑیئے کے بارے میں معلومات نے مجھے شرمندہ کردیا ہے کہ حضرت انسان کس مقام پر کھڑا ہے؟ اور ایک بھیڑیا جسے ہم سب نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ کتنا وفادار، مخلص اور ذہین ہے۔ آیئے ہم لوگ اپنے آپ کو انسانیت کے اصل مقام پر لے جانے کی کوشش کریں بدامنی، دہشت گردی اور ہر قسم کے فسادات سے پرہیز کریں کیونکہ یہ حضرت انسان کے شایانِ شان نہیں۔ آیئے سب اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور جہاں جہاں ہمیں اپنے کردار میں خامیاں اور کمزوریاں نظر آئیں اُنھیں ختم کرنے کی کوشش کریں، بھلے اُس کے لئے ہمیں بھیڑیئے ہی سے کیوں نہ سبق حاصل کرنا پڑے۔۔۔۔۔۔۔

عالم بالا سے معین اختر کا خط بنام انور مقصود

ہاں بھائی انور میاں! کیا حال ہے ابے بہت دن ہو گئے اب کوئی نیا پروگرام نہیں شروع کیا تو نے، Loose Tak کے بعد تو لگتا ہے تمہاری بولتی بند ہو گئی، ناراض نہیں ہونا اپُن تو ایسے ہی بولے گا بھائی، ہاں بھائی یہ تو تمہارا ہی دیا ہوا ہے، ارے کہاں وہ معین اختر ذرا وِس کو یاد کرو 1971ء کی بات تھی میاں پاکستان میں جنگ جاری تھی ہندوستان کے ساتھ، اور جناب ضیاء محی الدین شو میں ہمیں موقع مل گیا وس سے پہلے ہم چھوٹے چھوٹے سٹیج پر کام کرتے تھے اور بڑے بڑے فنکاروں کی نقل اُتارا کرتے تھے بھیا اور جب ضیاء محی الدین شو میں آئے تو بھیا محمد علی بھی موجود تھے وہاں پر اور میں نے Mechnaz Gold فلم کی نقل اُتاری اور اُس کے ساؤنڈ ایفیکٹ مائیک پر سُنائے اور صحرا میں گولی چلنے کی آواز جو تیرے بھائی نے نکالی تو پھر وس کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا بھائی نے۔ آہستہ آہستہ ڈراموں میں آ گئے، پھر تیرے ساتھ ملاقات ہوئی جس میں کے معین اختر شو تھا، پونے تین سلور جوبلی اور پھر خدا تیرا بھلا کرے اور ایک شو کیا جس میں بشریٰ انصاری اور میں نے وہ پروگرام کیا اپُن نام بھول گیا ہے۔ اور اب خدا تیرا بھلا کرے، اب جانے دے نام تو خود ہی یاد کر لینا، انور میاں جو مزہ Loose Talk اور ''روزی'' کرنے میں تیرے ساتھ آیا وہ کہیں نہیں آیا۔ اب عالم بالا میں بھی وہاں پر بہت بڑے بڑے لوگ ہیں بھیا ابے کیا بتاؤں ادھر غالب بیٹھے ہوئے ہیں اور آگے ذرا دیکھا تو ساتھ والے گھر میں میر تقی میر صاحب ہیں ابے محلّہ ہی ہمارا ہے کیا کرے، عالم بالا میں اس محلے میں سارے گلوکار، اداکار، شاعر اور ادیب رہتے ہیں بھیا ابھی تجھے پتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب بھی آ گئے ہیں ابے 95 پے

آؤٹ ہو گئے ابھی 5 رنز رہتے تھے 100 سال ہونے میں مگر سنچری پوری نہ کر سکے بڑی محفلیں جم رہی ہیں بہت مزے آ رہے ہیں۔ اور انور تمہیں سچی بات بتاؤں تیرا بھائی یہاں پر بھی Comparing کر رہا ہے، بھائی اب ہم کیا کریں یہ کرنا تو پڑے گا، اب اتنے بڑے بڑے لوگوں کی محفل ہے کہیں فیض بیٹھے ہیں، کہیں اقبال بیٹھے ہیں، کہیں قتیل شفائی ہیں اور کہیں پر ابے ساحر لدھیانوی بھی ہیں، چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں، اور کبھی کبھی سنا رہے ہوتے ہیں کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے۔ ہاں بھئی کتنا خیال آئے گا اور؟ اور کیفی اعظمی کی کیا بات ہے بھئی، واہ واہ کیا بات ہے، فراز اور پروین شاکر کی جوڑی بہت بنتی ہے۔ بھیا اور سارے کے سارے دوسرے شعراء اور یار لوگ جو ہیں وہ بہت جیلس ہو رہے ہیں فراز ہیں کہ سُنائے جاتے ہیں غزلیں، سُنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں اور فراز جسے آنکھ بھر کے دیکھتے تھے انو تجھے پتا ہے اُس کا کیا حال ہوتا تھا۔ ابے کیا بتاؤں بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی، ابے رہنے دے۔

انور بس عالم برزخ میں گزر رہی ہے اور دیکھو کب تک ہم نے یہاں ٹھہرنا ہے اب تو بس اوپر سے ہی دیکھتے ہیں کہ اپنے ملک کا کیا حال ہو رہا ہے۔ ابے ایک دو دفعہ میں نے سیاستدانوں کے محلے میں جانے کی کوشش کی مگر مجھے وہاں گھسنے نہیں دیا گیا، بس دور سے بینظیر بھٹو کی دیکھی تھی جھلک ،اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھے ہوئے کچھ باتیں کر رہی تھیں اور ضیاء صاحب بھی وہی منڈلا رہے تھے اور یونیفارم میں پھر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں جنرل ہوں یہاں بھی مائیک لگاؤ میں نے تقریر کرنی ہے۔ بس اتنا ہی میں نے سُنا میرے کانوں میں آواز آئی!

Nahmaduhu wa nusalli ala Rasoolihil Kareem

ama ba'd fa audhubillahi min ashshaitani arrajeem

اور میں سمجھا کہ یہاں بھی مارشل لاء لگنے والا ہے اور میں بھاگ آیا وہاں سے۔ بھیا تیرے ہاں کراچی میں اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں بلکہ پورے ملک میں ہی جو تبدیلی کی ہوا چل رہی ہے اُس کے کچھ نہ کچھ جھونکے اوپر بھی آ رہے ہیں ہمیں تو ابھی تک کوئی اچھی تبدیلی محسوس نہیں

ہو رہی۔میاں یہ ہے کہ پہلی دفعہ اہل پنجاب کے لیڈران کو بھی ذرا جیل کی ہوا کھانی پڑ رہی ہے ورنہ تجھے انور پتا تو ہے کہ لیاقت علی خان سے لے کر بینظیر بھٹو تک قربانیاں ہمیشہ چھوٹے بھائیوں نے ہی دی ہیں اب کے ذرا بڑا بھائی بھی قابو میں آ گیا ہے لیکن اللہ خیر کرے اب کے پاکستان کے حالات لگتا ہیں سدھر جائیں گے کیونکہ اب کی دفعہ تمام جو ہمارے قومی ادارے ہیں وہ ایک پیج پر ہیں اور یہ پیج کاغذ والا پیج نہیں ہے۔انور یہ پکا کام ہے اس دفعہ اور انشاء اللہ تم دیکھ لینا، پاکستان میں بہار ہو جائے گی، بہت خزاں دیکھ لی پاکستان کے غریب عوام نے۔اب تھوڑا سا تبدیلی کی خزاں کا کچھ موسم باقی رہ گیا ہے کیونکہ ملین ٹریز تو خان صاحب نے لگوا دیئے ہیں اور انشاء اللہ ان ملین ٹریز کی وجہ سے پاکستان میں ہر طرف خوشحالی اور ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی۔

بھیا انور بات یہ ہے کہ میں تھک گیا ہوں بھائی کوئی "لوز ٹاک" ہو گئی ہو تو بُرا مت منائیو۔۔۔

عالم بالا میں ایک بات کی کمی ہے، وہ سچے دل سے بات بتا رہا ہوں تجھے، اور کمی کیا ہے وہ کمی یہ ہے کہ انور تمھاری کمی ہے، بھیا ہاں کب آ رہے ہو، بتاؤ تمہارا منتظر تمہارا سکھایا ہوا معین اختر۔۔۔۔۔

معاف کیجئے۔۔۔۔۔خط بنام انور مقصود

انور میاں کیسے ہو؟ انور ناراض مت ہونا میاں لکھ دیا ہے، کافی دن سے سوچ رہا تھا کہ تمھیں عالم زیریں کی طرف سے بھی خط لکھا جائے، اب یہ کام میں نے اپنے سر لے لیا ہے اور ہاں اگر اپنا واٹس اپ نمبر لکھ کر بھیج تو ذرا خط لکھنے میں آسانی ہوگی۔ تمھارے نمبر کا مطلوب امین کنجاہی!

چلو ایک رات انتظار کرنے کے بعد کہ شاید تم نمبر بھیج دو مگر دل کہتا ہے کہ تم نے ابھی تک میرا پیغام پڑھا نہیں پھر دل میں وسوسوں نے دھرنا دیدیا کہ نہیں انور میاں نے پڑھ کر اِگنور کیا ہے میں نے ہمشیہ دل کی مانی ہے اور ہمیشہ نقصان اُٹھایا ہے۔ میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا انور میاں، اب ذرا زمین والوں کی چند باتیں ہو جائیں ہابیل سے کابیل سے جو فساد شروع ہوا وہ ابھی تک چل رہا ہے زور آور کمزور کو مار رہا ہے، لوٹ رہا ہے، کوئی روکتا نہیں، کوئی ٹوکتا نہیں۔ زمین پر ایسے ایسے ظلم کے سونامی چل رہے ہیں کہ یہ بات تم جیسا ذہین قلم کار بھی جانتا ہوگا مگر انور میاں کیا یہ سب ناانصافیاں ابد تک چلتی رہیں گی؟ اور کیا عدل اور انصاف کے نام پر آنے والے ظالم طاقتوں کے سامنے بے بس اور مجبور ہی رہیں گے؟ لوگ مرتے رہیں گے؟ مظلوم کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا رہے گا؟ انور پریشان ہو گئے؟ ہونا بھی چاہیے، تم نے تو تقسیم بھی دیکھی ہے، میں نے تو ایوبی دور میں آنکھ کھولی اور آج تک حالات ویسے ہی ہیں، اللہ جانتا ہے! کب ہمارے حالات ٹھیک ہوں گے ملک میں امن قائم کب ہوگا؟ ہم سب کب خوشحال ہوں گے؟ ملک میں آسانی کب آئے گی؟ تعلیم عام کب ہوگی؟ مریضوں کو مفت دوائیاں کب ملیں گی؟ مظلوموں کے قاتل کب پکڑے جائیں گے؟

انور تمہیں یہ خط لکھنے کا اصل مقصود یہ ہے اور جو سبب بنا وہ یہ کہ، ایک تو سانحہ ماڈل ٹاؤن جو کہ ابھی تک نہ سلجھایا جاسکا اور دوسرا سانحہ ساہیوال جس نے پورے ملک کو ہلا کا رکھ دیا تھا۔

انور تمھارے ساتھ ایک اور واقعہ شیئر کرنا چاہ رہا ہوں یہ 5 جون 1992ء کا دور تھا ٹنڈو بہاول سندھ کے ایک گاؤں میں ایک حاضر سروس اعلیٰ ادارے کے افسر نے (جن کا نام میں جانتا ہوں) جوانوں کے ساتھ چھاپہ مار کر 9 کسانوں کو گاڑیوں میں بٹھایا اور جام شورو کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے لے جا کر گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ اعلان کیا گیا کہ یہ افراد دہشت گرد تھے اور ان کا تعلق بھارت کے ادارے ریسرچ اینڈ اینالائس ونگ سے تھا۔ لاشیں گاؤں آئیں تو نہ صرف گاؤں بلکہ پورے علاقے میں کہرام مچ گیا ہر ماں اپنے بیٹے کی لاش پر ماتم کر رہی تھی۔ ان ماؤں میں ایک 72 سال کی بوڑھی عورت مائی جندو بھی تھی اس کے سامنے اس کے دو بیٹوں بہادر اور منٹھار اور داماد حاجی اکرم کی لاش پڑی تھی مگر وہ خاموش تھی۔ مائی جندو سکتے کے عالم میں بیٹوں اور داماد کے سفید چہرے دیکھے جا رہی تھی۔ انور ہر شخص کہہ رہا تھا کہ خاموشی سے میتیں دفنا دی جائیں قاتل بہت طاقتور ہیں ان غریب ہاریوں کا ایسے طاقت والوں سے کیا مقابلہ؟ مائی جندو کو بار بار رونے کے لئے کہا گیا تو اس نے وحشت ناک آنکھوں سے میتوں کی طرف دیکھا اور بولی بس مائی جندو ایک ہی بار روئے گی جب بیٹیوں کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکتا دیکھے گی۔ سب جانتے تھے ایسا ممکن نہیں تھا مگر لوگ خاموش ہو گئے مائی جندو کی بیٹیاں ٹُر لا رہی تھیں مگر مائی جندو ساکت بیٹھی قتل ہونے والوں کے میتوں کو دیکھی جا رہی تھی۔

انور میاں جنازے اُٹھے تو مائی جندو نے سر کی چادر کمر سے باندھی سیدھی کھڑی ہوئی اور لہو روتے جگر کے ساتھ بیٹوں کو الوداع کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ ٹنڈو بہاول اندرونِ سندھ کا ایک دور دراز گاؤں تھا اور تب دریائے سندھ کے اس کنارے قتل ہونے والوں کی ویڈیو بنانے کے لئے موبائل کیمروں کا دور بھی نہیں تھا۔ خبر چلی کہ دشمن کے ایجنٹ مار کر ملک کو بڑے نقصان سے بچا لیا گیا ہے جس نے پڑھا سُنا اُس نے شکر کیا جب سارا ملک شکرانہ ادا کر رہا تھا تب مائی جندو نے احتجاجی چیخ ماری۔ اس چیخ نے پرنٹ میڈیا کی دُنیا میں ہلچل مچا کر رکھ دی، مائی جندو بوڑھی تھی جسمانی لحاظ سے

کمزور مگر وہ تین مقتولوں کی ماں تھی اس نے انصاف کیلئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے دو بیٹیوں کو ساتھ لے کر قاتلوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا یہ جنگ آسان نہ تھی مگر نقارے بج چکے تھے کشتیاں جل چکی تھی، واپسی محال تھی۔ اخباروں اور صحافیوں کے ہمراہ مائی جندو نے اس چیخ کو قاتلوں کے سینوں میں گھونپ دیا، پہلی جھڑپ ختم ہوئی، گرد چھٹی تو معلوم ہوا کہ قتل ہونے والے دہشت گرد نہ تھے بلکہ زرعی زمین کا جھگڑا تھا جس کی سزا میں انھیں قتل ہونا پڑا 24 جولائی 1992 کو اس افسر کے کورٹ مارشل کا حکم دیا گیا 29 اکتوبر کو فیلڈ جنرل کورٹ مارشل نے اس افسر کو سزائے موت اور 13 اہل کاروں کو عمر قید کی سزا سُنا دی۔ اس افسر نے رحم کی اپیل کی جو 14 ستمبر 1993ء کو مسترد ہوئی اس کے بعد رحم کی اپیل صدر مملکت سے کی گئی جو 31 جولائی 1995ء کو مسترد تو کر دی گئی لیکن سزا پر عملدرآمد روک لیا گیا اس کے بعد افسر کے بھائی کی اپیل پر سپریم کورٹ نے حکم امتناع جاری کیا اور سزا روک دی سزائے موت پر عمل نہ ہونے پر 11 ستمبر 1996ء کو مائی جندو پھر میدان میں نکل آئی اس کی دو بیٹیوں نے حیدر آباد پریس کلب کے سامنے اپنے جسموں پر تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لی ان کو نازک حالت میں ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ بچ نہ سکیں۔ پورے ملک میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا بالآخر 28 اکتوبر 1996ء کو طاقت کی دیواریں مائی جندو کے مسلسل دھکوں کے سامنے ڈھیر ہوگئیں یہ حیدرآباد سینٹرل جیل تھی، جہاں مائی جندو کو پھانسی گھاٹ پر لایا گیا سامنے تختہ دار پر اس کے سامنے اس کے گاؤں کے 9 بیٹوں کا قاتل افسر کھڑا تھا۔ تختہ کھینچا گیا تو قاتل افسر کا جسم دار پر جھول گیا، اسی وقت سامنے کھڑی مائی جندو کی بوڑھی مگر زور آور آنکھ سے ایک اشک نکلا اور اس کے رخسار کی جھریوں میں تحلیل ہو گیا۔

انور اگر 1992ء کا یہ واقعہ اکتوبر 1996ء تک کسی نہ کسی طرح بے گناہوں کی اور مظلوموں کی دعاؤں اور آہوں کی وجہ سے عدل اور انصاف حاصل کر سکا تو کیا وجہ ہے کہ سانحہ ماڈل ٹاؤن جس میں کہ 14 بے گناہ خواتین وحضرات کی جانیں لی گئیں اور اُس سانحہ پر ایک جے آئی ٹی بھی بنائی گئی مگر آج تک اُن قاتلوں کو نہیں پکڑا گیا اور اسی طرح کا جو واقعہ سانحہ ساہیوال میں ہوا اور جس میں بے گناہ انسانوں کی جانیں گئیں اور وہ بھی یونیفارم میں ملبوس ملک کے محافظ لوگوں نے ایک

ایسا عمل کیا جس نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ انور کیا آج تک اور ابھی شاید کتنے برس تک ایسے بے شمار واقعات ہوتے رہیں گے؟ اوران واقعات اور سانحوں پر کوئی عدل کسی غریب اور لاچار کو نہیں مل پائے گا؟ انور کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟ ہم عام اور غریب لوگ کس کے آگے اپنے دامن کو پھیلائیں اور عدل اور انصاف مانگیں؟

انور میاں اب آنکھوں میں پانی آنے لگ پڑا ہے پھر کچھ دن کے بعد اگر تم نے جواب دیا تو مزید بات ہوگی اور عالم زیریں کے اور کچھ زخم گھاؤ اور ظلم کی کچھ داستانیں تمہارے ساتھ شیئر کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُمید کرتا ہوں کہ تمہیں بھی عالم بالا سے کوئی خط ضرور ملے گا کہ جس میں تمہیں غالب جوش صاحب، فیض صاحب، فراز اور منیر کی طرف سے حالات کا پتا چلے گا فی الحال جو میرے دل پر گزری جو میری روح نے برداشت کی وہ میں نے تمہارے ساتھ بیان کر دی ہے اب جو کہ قلم کا دور نہیں رہا اس دور میں کمپیوٹر کے کی پیڈ سے اجازت چاہوں گا۔

تمہارا خیر اندیش

فقط دُعا گو

امین کنجاہی اسلام آباد سے

جاگتے رہنا

ہم چھوٹے چھوٹے تھے، تقریباً سات سات برس یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ ہماری عمریں تھیں، جب سے ہم فضلو چچا کی آواز رات سونے سے پہلے اپنے محلے میں سُنا کرتے تھے" جاگتے رہنا" اور یہ الفاظ دھراتے ہوئے فضلو چچا ایک ہاتھ سے ڈنڈا بھی ہمارے گھروں کی تھڑیوں پر زور زور سے مارا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا، پہلے فضلو چچا کے ایک ہاتھ میں لال ٹین بھی ہوا کرتی تھی، مگر جب وقت نے رفتار بدلی تو فضلو چچا کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹارچ آگئی۔ ہم لوگ بڑے حیران ہوا کرتے تھے کہ فضلو چچا ساری رات نہیں سوتا، ہم ماں سے پوچھا کرتے تو ماں کہتی، ہاں پتر فضلو چچا ساری رات نہیں سوتا وہ اس لئے کہ ہم گاؤں کے سب لوگ آرام سے سو سکیں۔ میں پوچھتا، اماں فضلو چچا کو نیند نہیں آتی، کیا فضلو چچا کا گھر نہیں ہے، کیا اُس کے بچے نہیں ہیں؟ ماں مسکراتی اور کہتی زاہد پتر وہ یہ سب کچھ اپنے بچوں کے لئے ہی تو کرتا ہے۔

فضلو چچا کی عمر 65 برس سے زیادہ ہو چکی تھی، گھر والی کو دمے کی بیماری تھی، انکی ایک ہی اکلوتی بیٹی شمع باجی تھی۔ جب موسم تبدیل ہوتا تو چاچی کی بیماری میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ فضلو چچا مہینے کی پہلی تاریخوں کے بعد ہمیں دن میں نظر آیا کرتا اور سارے محلے سے اپنی تنخواہ وصول کیا کرتا، کوئی اُسے 2 روپے دے دیتا، کوئی 5 روپے، بعض ایسے لوگ بھی تھے جو فضلو چچا کو گندم دیدیا کرتے اور مونجی کے موسم میں تنخواہ کے طور پر مونجی دیدی جاتی۔ سردیوں کے موسم میں بڑے ذمہ دار جو تھے وہ گڑ اور موسمی سبزیاں بھی دے دیا کرتے تھے، ہر عید پر فضلو چچا کو میری ماں نئے کپڑے بنوا کر دیا کرتی تھی۔ فضلو چچا نا آندھی دیکھتا، نہ طوفان، نہ سخت گرمی کی راتیں دیکھتا، بس

اُس کا تو کام تھا رات 10 بجے کے بعد آواز لگانا'' جاگتے رہنا۔۔۔ جاگتے رہنا۔۔۔''
فضلو چچا کا روٹ ہمارے گاؤں کے محلے کٹڑا مصرام سے شروع ہوتا اور عید گاہ محلے سے ہوتا ہوا مشین محلہ ککے زحیاں سے ہوتا ہوا پورے بازار میں سے گزرتا۔ فضلو چچا نے کئی ڈکیتوں کو پکڑا اپنی جان پر کھیل کر، کئی دُکانوں کے تالے ٹوٹنے سے بچائے، اُن بیٹیوں کو رات کے اندھیرے میں باعزت طور پر گھروں میں واپس چھوڑ کر آتا جو اپنے ماں باپ کی عزت کو مٹی میں ملانے کے لئے اپنے آشناؤں کے ساتھ فرار ہو رہی ہوتیں، مگر فضلو چچا نے کبھی بھی کسی کے بارے میں زبان نہ کھولی حالانکہ صبح کی جب روشنی ہوتی تو پورے محلے میں چہ میگوئیاں شروع ہو جایا کرتیں کہ رات کو نواز شراب پی کر گلی کی نکڑ پر گرا ہوا تھا اور اول فول بک رہا تھا، مگر جب بھی فضلو چاچا سے ایسے واقعات کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتا، کہتا'' پتر سب ستے خیراں نے، میں ہوں نا رب سب خیر کرتا ہے، او گھبراتے کیوں ہو میرے بچو، آرام سے رات کو سویا کرو میں ہوں نا''
اس دفعہ سردیوں کا موسم بہت شدید تھا سخت بارشیں شروع ہو چکی تھیں بارشیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں، فضلو چچا جو کہ اب بزرگ ہو چکا تھا مگر اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے ادا کر رہا تھا، اب اُس کی آواز میں وہ گھن گھرج نہیں رہی تھی۔ اب جب بھی وہ آواز لگاتا تو کھانسی اُس کی آواز کو راستے میں ہی روک لیتی اور ڈنڈے کی آواز بڑی مدھم سی تھڑیوں پر پڑتی۔ ہمارے گاؤں کی اکثر گلیاں 10 فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھیں اُن کے دونوں طرف نکاسی آب کے لئے نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ بارش شدید ہو رہی تھی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں گرم رضائیوں میں گھسے ہوئے تھے کہ اتنے میں رات کے کوئی 2 بجے ہوں گے۔ میں لاہور سے واپس آ رہا تھا، راولپنڈی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا جب وزیر آباد قریب آیا تو میں نے کنڈیکٹر سے کہا کہ مجھے شاہین چوک پر اُتار دینا، اُس نے کہا باؤ جی بارش بڑی ہو رہی ہے۔ میں نے کہا یار میں نے اپنے گھر تو جانا ہے نہ کوئی بات نہیں، اُس نے ڈرائیور کو آواز لگائی اُستاد جی شاہین چوک گڈی روکنا۔ اُس نے پوری بس میں آواز لگائی، کوئی اور ہے جس نے بس سے اُترنا ہے۔ کوئی اور سواری نہ بولی، شاہین چوک آ گیا، میں شدید بارش میں ہاتھ میں بیگ پکڑے اُترا اور کسی گاڑی یا چینگچی والے کو دیکھنے لگا، مجھے

قریب ہی ایک سگریٹوں کا کھوکھا کھلا نظر آیا، میں وہاں جا کر کھڑا ہو گیا اور سردی سے بچنے کے لئے کھوکھے والے سے سگریٹ لیا اور سلگایا۔ میں نے اُس سے پوچھا یہاں سے کوئی گاڑی یا رکشہ مل جائے گا؟ اُس نے کہا باؤ جی کہاں جانا ہے آپ نے؟ میں نے کہاں کنجاہ جانا ہے۔ اُس نے کہا باؤ جی میں بھی کنجاہ کا رہنے والا ہوں ابھی اپنا کھوکھا بند کر کے نکلنے ہی والا تھا کہ آپ آگئے میرے پاس باؤ جی موٹر سائیکل ہے مگر بارش شدید ہو رہی ہے آپ بھیگ جائیں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا شکر ادا کیا کہ چلو کوئی سواری کا بندوبست تو ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا کوئی بات نہیں تمھاری بہت بڑی مہربانی ہوگی کہ تم مجھے قینچی تک اُتار دو۔ پھر میں اُس کے ساتھ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، اُس نے ایک برساتی اپنے اوپر پہن لی اور موٹر سائیکل چلانے لگ پڑا۔

سرگودھا روڈ ہیوی ٹریفک کی وجہ سے بڑی مشکل اور خطرناک روڈ ہے وہ سردیوں کی شدید بارش والی رات میں اور زیادہ خوفناک محسوس ہو رہی تھی، موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ پر بارش کے قطرے نظر آرہے تھے، باقی ارد گرد گھپ اندھیرا تھا، کوئی کوئی گاڑی قریب سے تیزی کے ساتھ گزر جاتی، چھینٹے اُڑاتی ہوئی تو کھوکھے والا موٹر بائیک سڑک سے نیچے اُتار لیتا یہ چھ سات کلومیٹر کا راستہ مجھے لاہور کے سفر سے بھی زیادہ طویل اور لمبا محسوس ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے قینچی آگئی اور میں نے اُس سے پوچھا تم نے آگے کہاں جانا ہے؟ اُس نے کہا ڈنگہ روڈ جانا ہے۔ میں نے اُس سے کہا تم مجھے یہاں قینچی پر اُتار دو۔ اُس نے کہا باؤ جی نہیں آگے آپ نے کون سے محلے جانا ہے؟ میں نے کہا محلّہ کٹڑا مصرام جانا ہے، اُس نے کہا کوئی بات نہیں میں اندر سے نکل جاتا ہوں آگے شبیر شریف ہسپتال سے سیدھا میں ڈنگا روڈ نکل جاؤں گا۔ پھر اُس نے مجھے میرے گھر کے باہر گلی کی نکڑ پر اُتار دیا، جب میں موٹر سائیکل سے اُترا تو دیکھا چاچا فضلو شدید سردی میں کانپتے ہاتھوں میں بیٹری پکڑے ہوئے، اونچی آواز میں بولا ''کون ہے او جواناں''؟ میں نے کہا چاچا فضلو میں ہوں زاہد، چاچا فضلو بولا ''پتر اتنی بارش میں اتنی ٹھنڈ میں کدھر سے آرہا ہے؟'' میں نے کہا چاچا لاہور گیا تھا تو شاہین چوک سے مجھے یہ بھائی صاحب ملے ہیں، انھوں نے مجھے گھر تک چھوڑا ہے۔ میں نے پوچھا چاچا سُنا چاچی کا کیا حال ہے؟ چاچا نے کہا ''پتر اُس شودی کا کیا حال ہونا ہے، نہ جیتی ہے، نہ مرتی ہے، بس

مالک کا شکر ہے، جتنی سانس کی ڈوری ہے وہ تو پوری ہونی ہے نہ، او تیری بہن ماں کا بڑا خیال رکھتی ہے پتر اوئے''

چاچے فضل کی ایک ہی بیٹی تھی جسے ہم شمع باجی کہا کرتے تھے، میں نے کہا چچا سردی میں تو آرام کر لیا کر۔ چاچے نے کہا'' پتر اگر میں آرام کرنے پر آ گیا تو گاؤں والے کیسے آرام سے سوئیں گے، ڈکیتیاں اور چوریاں بڑھ جائیں گی پتر'' میں چاچے کو خدا حافظ کہہ کر اپنی گلی میں داخل ہو گیا، اور چچا پھر آواز لگانے لگ گیا'' جاگتے رہنا۔۔۔۔۔ جاگتے رہنا۔۔۔۔۔'' میں نے دروازہ کھٹکھٹایا ماں نے دروازہ کھولا اور کہا پتر زاہد اتنی بارش میں اتنی دیر سے کیوں چلا لاہور سے صبح آ جاتا۔ میں نے کہا نہیں اماں مجھے گھر یاد آ رہا تھا، جلدی سے گرم کپڑے دے، میں بدلوں اور گرم رضائی میں گھس جاؤں۔ ماں نے مجھے گرم گرم دودھ کا گلاس دیا اور میں وہ پی کر بستر میں گھس گیا، صبح جب ہوئی تو پورے محلے میں شور مچا ہوا تھا، کہ چچا فضلو کی بیٹی شمع گھر سے بھاگ گئی ہے۔۔۔۔۔۔۔

دُنیا بنانے والے کیا تیرے من میں سمائی

میں آفس میں بیٹھا ہوا تھا اچانک موبائل کی گھنٹی بجی دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز نے پہلے میرا نام پوچھا پھر مجھے اطلاع دی کہ سر آپ کے لاکر کا کرایہ Due ہے فوری طور پر ادا کر دیں۔ میں نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا، اوہو میرے ذہن میں تھا کہ میں کرایہ ادا کر چکا ہوں چلیں یہ بتا دیں کہ ہفتے کو بینک کھلا ہوگا؟ تو بی بی نے جواب دیا جی ساڑھے بارہ بجے دوپہر تک۔ میں نے ہفتے کو آنے کی حامی بھر لی پھر فون بند کر کے اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ ابھی ہفتہ آنے میں تین دن باقی تھے مگر میں نے طے کرلیا کہ اس ہفتے بینک ضرور جاؤں گا انتہائی سست ہوں لٰہذا میں تین دن اپنے آپ کو پکا کرتا رہا کہ بینک جانا ہے۔ اپنی بیوی کو بھی یہ خبر جب سُنائی کہ میں نے ہفتے کو بینک جانا ہے تو وہ بھی بڑی حیران ہوئی اور کہنے لگی دیکھیں گے اور ہاں اگر آپ واقعی ہی بینک چلے گئے تو گھر کا ٹیکس بھی آگیا ہے وہ بھی جمع کروا دینا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگ پڑا کہ ابھی بیٹے کے سمسٹر کی فیس اور بیٹی کے کالج کا داخلہ بھی کروانا ہے۔ پھر میں نے یہ سارے کام اللہ پر چھوڑ دیئے کیونکہ بزرگ کہا کرتے ہیں کہ کچھ کام اللہ پر بھی چھوڑ دیا کرو۔ پھر ہفتہ آگیا میری بیوی نے طنزیہ انداز میں کہا صاحب ہفتہ آگیا ہے۔ میں نے فوراً عباسی کو فون کیا اور پوچھا ''عباسی صاحب کہتے ہو؟'' تو اُس نے کہا کہ میں 501 ورک شاپ کے قریب ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ جب میرے گھر کے باہر آئیں تو بیل مار دیں میں باہر آجاؤں گا کیونکہ میں نے صدر جانا ہے۔

عباسی ہمارے محلے میں ٹیکسی چلاتا ہے کوئی 15 منٹ کے بعد عباسی اور میں بینک جانے کے لئے

صدر کی طرف رواں دواں تھے، کینٹ میں حسب عادت عباسی سے سگریٹ لی اور سوٹا لگانے لگا ہم چاندنی چوک سے ہوتے ہوئے وارث خان، کمیٹی چوک، لیاقت باغ، مریڑ سے ہوتے ہوئے صدر بینک روڈ تک جا پہنچے جب میں نے بینک کی طرف دیکھا تو عباسی سے کہا، یار بینک کہیں بند تو نہیں؟ عباسی نے کہا کہ نہیں ابھی 9 نہیں بجے، 9 بجے تک کھل جائے گا۔ عباسی نے اپنی ٹیکسی پارک کی اور ہم دونوں سائے کی تلاش میں بینک کی بائیں طرف کھڑے ہو گئے جب ہم وہاں کھڑے ہوئے تو ہم نے وہاں سٹولز پر بیٹھے 4 افراد دیکھے جن میں سے 3 کی عمریں 60 اور 70 برس کے درمیان تھیں اور ایک کوئی پچاس کے پیٹے میں تھا۔ ہم اُن کے درمیان کھڑے ہو گئے وہ چاروں چائے پینے کے لئے ایک بزرگ کو گھیر رہے تھے مگر وہ اُن کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کیونکہ باتونی واقعہ ہوا ہوں، میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے لگ پڑا میں نے اُن بزرگ سے نام پوچھا، اُن چاروں کے ہاتھوں میں بینک سے متعلق بہت سے فارم تھے جن میں پینشن، اکاؤنٹ کھلوانے کے، بیرون ملک سے پیسے وصول کرنے کے فارم۔ یہ سب لوگ مختلف محکموں سے ریٹائرڈ تھے جس بزرگ سے میں نے بات کی اُن کا نام ظہور تھا، اور وہ سی ایم اے ملٹری اکاؤنٹس سے ریٹائرڈ تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا آپ کس سکیل میں ریٹائرڈ ہوئے ہیں؟ تو انہوں نے بڑا چوڑا سینہ کر کے کہا 16 سے اور مجھے ریٹائرڈ ہوئے 10 برس ہو چکے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ظہور صاحب سے اُن کی پینشن پوچھی تو انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ 36,000 روپے ماہانہ۔ میں نے ایک دم کہا کہ آپ پھر یہاں کیوں کام کر رہے ہیں آپ آرام سے اپنے گھر میں اپنے بچوں میں رہیں ماشاءاللہ آپ کی اس مہنگائی میں اتنی اچھی پینشن ہے کہ اگر آپ کی زوجہ حیات ہیں تو آپ ہنسی خوشی اپنی باقی ماندہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ جب میں نے یہ بات اُن سے کی تو اُن کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی مجھے بتانے پر مجبور ہو گئے کہ بیٹا میری بیوی وفات پا گئی ہے اور گھر میں میری بہو، میرے پوتے پوتیاں اور میرا بیٹا ہے جسے کہ میں نے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اپنے ہی دفتر سی ایم اے یعنی ملٹری اکاؤنٹس میں یو ڈی سی بھرتی کروایا ہے، میرے ماہانہ 36,000 روپے پینشن اور میرے بیٹے کی تقریباً 24 سے

25 ہزار روپے تنخواہ مل کر بھی ہم لوگ گھر کا خرچہ نہیں چلا سکتے پُتر مہنگائی بڑی ہے میرے بیٹے کے 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں جو کہ سکول اور کالج میں پڑھتے ہیں میڈیکل ہمارا سرکاری ہسپتال کا ہے جہاں پر کوئی سننے والا نہیں ہوتا اگر ایمرجنسی میں جانا پڑے تو لاوارثوں کی طرح ہمیں دیکھا جاتا ہے جب تک کہ کسی بڑے افسر کا ریفرنس نہ ہو پُتر آج کی دُنیا بڑی مشکل ہو گئی ہے۔

اس سب کے باوجود ظہور صاحب بڑے رکھ رکھاؤ اور باعزت انسان لگتے تھے، گو کہ اُن کی قمیص کا کالر پھٹا ہوا تھا اور سردی کے موسم میں نیچے اُنھوں نے ایک نیلے رنگ کا باریک سا سویٹر پہنا ہوا تھا یہ تو ظہور صاحب کی کہانی تھی میں نے باقی جب 3 دوسرے لوگوں پر نظر دوڑائی تو اُن میں سے بھی 2 بزرگ بہت ہی زیادہ مخدوش حالت میں نظر آتے تھے، ایک صاحب کے جوتے ٹوٹے ہوئے تھے اور اُن کی پاؤں کی ایڑیوں پر بے شمار غربت کی تریڑیں پڑی ہوئی نظر آرہی تھیں اِن چاروں میں سے سب سے اچھی حالت میں ایک 50 سالہ جوان تھا، جو کہ نیا نیا اِن کے گروپ میں شامل ہوا تھا اور اِن سے چائے پینے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے ظہور صاحب سے پوچھا آپ کتنی دیر تک یہاں بیٹھتے ہیں کام کیلیئے؟ اُنھوں نے کہا پُتر تقریباً ایک ڈیرھ بجے تک اور جب دن کا خرچہ پورا ہو جاتا ہے تو میں اپنا سٹول اُٹھا کر قریب ہی ایک دُکان پر اُلٹا رکھ جاتا ہوں اُس کو زنجیر ڈال کرتا کہ کوئی چوری نہ کر سکے، اور پھر شام کو جاتے ہوئے بچوں کے لئے روزمرہ کی سبزی اور ضروریات زندگی حسب توفیق خرید کر گھر چلا جاتا ہوں مجھے یہ کام کرتے ہوئے 10 برس ہو چکے ہیں۔

ابھی میرا دل اُن سے اور باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا مگر مجھے عباسی نے کہا، بینک کھل گیا ہے جی۔ پھر میں نے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے اور اُس شخص کی طرف بڑھائے جو اِن 3 بزرگوں سے چائے پینے پر اصرار کر رہا تھا مگر ان تینوں نے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیئے کہ نہیں نہیں ہم نے نہیں لینے، ہم چائے پی لیں گے مگر اُس چوتھے شخص کا دل تھا کہ وہ یہ پیسے مجھ سے لے لے مگر اِن بزرگوں کے زور دینے پر وہ یہ جرأت نہ کر سکا اور میں یہ سوچتا ہوا بینک کی طرف روانہ ہو گیا کہ یا اللہ تیری دُنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں جو اپنی سفید پوشی چھپائے ہوئے اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہے ہیں۔ کیا اِن کی خواہشات نہیں ہیں، کیا اِن کی ضروریات نہیں ہیں کہ یہ اپنے بچوں کو اپنی

مرضی کے کھلونے لے کر دے سکیں، عید کے عید یا اُن کی سالگرہ کے دن اپنی پسند کے کپڑے جوتے، کیک اور کھلونے لے کر دے سکیں، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ سفید پوش لوگ جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے، نہ اپنی مجبوریاں ظاہر کر سکتے ہیں، اور ساری عمر کبھی بھی اپنی مرضی کی اشیاء خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، انھیں ہمیشہ اپنی جیب کی مرضی سے روزمرہ کی چیزیں خریدنا پڑتی ہیں، نہ ہی یہ لوگ بے ایمانی کر سکتے ہیں جھوٹ اور فراڈ کر سکتے ہیں، مگر پھر بھی تیری رضا پر خوش رہتے ہیں، رب کبھی تو ان کی جیب میں اتنی دولت عطا فرما کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے خاندان اور اپنے بچوں کے لئے آسانیاں خرید سکیں، اور ہر دفعہ اپنے بچوں کو یہ دلاسہ نہ دے سکیں کہ پتر اگلی پہلی پر میں تجھے تیری من پسندیدہ چیز ضرور لے کر دوں گا اور بچے بھی کتنے معصوم ہیں وہ اپنے باپ دادا کی دی ہوئی تسلی پر یقین کر لیتے ہیں کہ ہاں انشاءاللہ اگلی دفعہ مجھے میری من پسند کی چیزیں، میرے لباس، میرے کھلونے ضرور ملیں گے اور میری چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کہ بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں اُن کے بچے بے شمار رزق ضائع کرتے ہیں اور انھیں کوئی روکنے والا نہیں ہوتا، کبھی اُنھوں نے بھوک نہیں دیکھی، تنگ دستی نہیں دیکھی۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو سڑکوں پر سوتا ہے پلوں کے نیچے سردیوں میں بغیر کمبل اور رضائی کے جنھیں امیر ہونے کی کوئی خواہش بھی نہیں۔ اِن 3 طبقوں میں سب سے زیادہ سفید پوش لوگوں کا طبقہ ہے جو کہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔۔

یہ سوچتے ہوئے میں اپنے لاکر کا بل ادا کر کے عباسی کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔۔

دنیاداری

عارف تھکا ہوا آفس سے گھر آیا تھا اور ابھی آکر اپنے بوٹ اور جرابیں اُتار رہا تھا کہ رافعہ آگئی۔ رافعہ بولی، آپ آفس سے آگئے؟ عارف نے کہا ہاں دیکھ نہیں رہی ہو آگیا ہوں تو گھر میں بیٹھا ہوں۔ رافعہ کے چہرے سے عارف کو محسوس ہوا کہ کچھ غصے میں ہے اور الجھی الجھی سی ہے مگر عارف نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رافعہ نے عارف کے بوٹ اور جرابیں اُٹھائیں اور جا کر جوتوں والی الماری میں رکھ دیں اور عارف کے سلیپر اُٹھا کر اُس کے پاؤں کے آگے لا کر رکھ دیئے۔

عارف نے سلیپر پہنتے ہوئے پوچھا بچے کدھر ہیں؟ رافعہ نے کہا یہی کہیں ہوں گے کہا جانا ہے ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں میں تو تنگ آجاتی ہوں ان کی بک بک جھک جھک سے۔ عارف مسکرایا اُس نے کہا خدا کا شکر ادا کرو کہ تمھارے ہاں اولاد ہے اُن ماؤں سے پوچھو جن کے ہاں بچے نہیں پیدا ہوتے وہ بانجھ ہوتی ہیں ساری عمر اس کسک اور تکلیف میں گزار دیتی ہیں کہ وہ ماں نہیں بن سکتیں۔ پھر عارف نے کہا انسان بھی کتنا ناشکرا ہے اگر کوئی چیز بن مانگے مل جائے تو اُس کی قدر نہیں کی جاتی اور اگر نہ ملے تو رب سے گلے شکوے شروع ہو جاتے ہیں رافعہ خدا کا شکر ادا کیا کرو اُس کے آگے اپنا سر جھکائے رکھنا ہی انسان کا اصل کام ہے۔ عارف یہ کہتا ہوا کھانے کی ٹیبل کی طرف گیا تو وہاں ٹیبل پر پڑے ہوئے اُسے یوٹیلٹی بلز نظر آئے۔ اڑے یہ بھی آگئے ہیں

عارف کے منہ سے ایک دم سے نکلا کتنے کلھپڑ کا ہے اُس نے بلوں کو ہاتھ میں پکڑ تے ہوئے دیکھا ۔ارے بجلی کا بل اتنا زیادہ، ابھی تو گرمیاں شروع بھی نہیں ہوئیں، اور گیس کا بل بھی آ گیا یہ چلو یہ تو خیر ورے میں ہی ہے اور جناب پانی کا بل پہلے یہ 2 ماہ کا بھیجتے تھے اب یہ 3 ماہ کا کر دیا ہے ہماری تنخوائیں بڑھ گئیں ہیں کیا؟ گورنمنٹ والے کیا کرتے ہیں ہر ماہ یوٹیلٹی بلوں کی مد میں پیسے ایسے بڑھاتے ہیں جیسے کوئی ریڑھی والا سبزی فروش اپنے مرضی سے سبزیوں کے بھاؤ بڑھاتا چڑھاتا ہے۔

عارف منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا، یار اس کی آخری تاریخ کون سی ہے؟ یہ تو دیکھو لو جی، اس کی آخری تاریخ تو 29 اپریل ہے خدا کا خوف نہیں ہے اِن کو میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں جیب میں ، رافعہ تمہارے پاس کچھ بچت کی پونجی پڑی ہے اپنے حساب میں سے؟ عارف نے رافعہ سے پوچھا ۔رافعہ نے کہا! آپ دیتے ہی کتنا ہو مجھے خرچ کی مد میں، میرے پاس کوئی پیسے نہیں ہیں بچوں کی فیسیں دی ہیں گاڑی والی کی فیس دی ہے، ٹیوشن کے پیسے الگ دیئے ہیں قاری صاحب کو بھی دیئے ہیں مسجد کا چندہ اس کے علاوہ ہے اور گھر میں آیا گیا مہمان داری الگ سے ۔۔۔ عارف صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں اور ہاں پچھلے ماہ جو آپ کے بھائی صاحب فوت ہوئے تھے اُن کا چہلم بھی آ رہا ہے یہ بھی ذرا ذہن میں رکھیے، اب لے! یہ تو میں بھول گیا تھا عارف نے ایک دم چونک کر کہا چلو تم ایسا کرو بل تو دینے ہیں چونکہ تنخواہ تو 2 تاریخ کے بعد ملتی ہے لہٰذا اوپر والے ہمسایوں سے پوچھ لو اگر اُن کے پاس پیسے ہیں تو اُن سے لے لیتے ہیں تنخواہ آنے پر اُن کو ادا کر دیں گے ۔رافعہ نے کہا، میں کوشش کرتی ہوں مگر وہ بھی بیچارے ہماری طرح سرکاری ملازم ہیں سفید پوش لوگ ہیں، اُن کے پاس بھی بھلا کہاں ہوں گے چلیں ایک کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں، آپ کی بہن کا فون آیا تھا آج ۔رافعہ نے عارف سے کہا۔

عارف نے کہا اب میں کچھ اور بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں برائے مہربانی مجھے چائے کا ایک کپ یا کچھ کھانے کے لئے دو۔ رافعہ نے کہا، نہیں نہیں میں کوئی ایسی بات نہیں کر رہی آپ کی باجی کا فون تھا آپ کو پتا تو ہے نہ کہ جب سے نوید نے دوسری شادی کی ہے اُن کا رویہ میرے ساتھ کچھ

زیادہ اچھا نہیں ہے تو۔ عارف تھوڑا تلخی سے بولا تو بات تو ٹھیک ہے نا تمہارے بھائی نے دوسری شادی کیوں کی کیا کمی تھی ہماری بہن میں جو اُس نے دوسری شادی کی؟ رافعہ نے ایک دم سے چڑ کر کہا آپ بھی دوسری شادی کر لیں حساب برابر ہو جائے گا اور آپ کی بہنیں تو دل ہی دل میں چاہتی ہی یہیں ہیں کہ مجھ پر سوتن آئے اور اُن کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ جائے۔ مگر عارف کچھ نہ بولا خاموشی سے رافعہ کی باتیں سنتا رہا۔

رافعہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی اور عارف اپنے بیڈروم میں آ کر لیٹ گیا پھر اُس کی سوچوں کی ریل اُسے اپنی شادی کے موقع پر لے گئی جب عارف اور رافعہ کی اور نوید اور عارف کی بہن کی وٹے سٹے کی شادی طے پا رہی تھی اُس وقت سب خوش تھے ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، آپس میں تائے چچا کے بیٹے تھے، بیٹے اور بیٹیاں تھے، کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وٹے سٹے کی شادی کیوں ہو رہی ہے مگر خاندان کے کچھ بزرگ خواتین و حضرات کو ڈر تھا کہ ایسی شادیاں اکثر کامیاب نہیں ہوا کرتیں مگر ان لوگوں کی شادیوں کو 10 برس بیت چکے تھے۔ عارف اور رافعہ بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے ان کے 2 بچے تھے جبکہ نوید اور شہناز پہلے دن ہی سے ازدواجی رشتے میں اکھڑے اکھڑے سے محسوس ہونا شروع ہو گئے تھے اس میں کچھ نوید کا ضدی پن اور شہناز کا ہٹ دھرمی کا رویہ بھی شامل حال تھا جیسے تیسے ان 10 برسوں میں نوید کے ہاں بھی 2 بیٹے پیدا ہوئے۔ رافعہ کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا نوید نے لاء کیا ہوا تھا لہٰذا وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے بہانے ملک سے باہر چلا گیا 3 سال کے لئے اب پیچھے شہناز اور نوید کی والدہ اماں جی اور دو بیٹے ایک بہت بڑی حویلی میں رہ رہے تھے، نوید کا پندرہ دن کے بعد ایک فون آ جاتا اور گھر کی خیر خیریت ماں جی کا حال، اُن کی دوائیوں کے بارے میں پوچھتا اور شہناز سے بات کرتے ہوئے پھر بحث تکرار شروع ہو جاتی اور پھر آخر میں فون کھڑک سے بند ہو جاتا۔ چونکہ نوید جاتے ہوئے شہناز کو بہت محدود ماہانہ رقم دے کر گیا تھا دے کر بھی کیا گیا تھا یہ کہہ کر گیا تھا جو گھر کے باہر دُکانیں ہیں اُن کا کرایہ جو آئے گا اُس میں تم نے پورے مہینے کا گزارہ کرنا ہے 6 دکانوں کا کرایا بمشکل 24000 مہینہ بنتا تھا اس میں بچوں کی فیسیں گھر کا روزمرہ کا خرچہ بجلی کے بل اور دوسرے

اخراجات پورے کرنا شہناز کے لئے بہت ہی مشکل کام ہو جاتا تھا اور پھر کبھی کبھی اماں جی بھی پیسے مانگ لیا کرتیں کہ شہناز آج میرے پاس پیسے نہیں ہیں کچھ پیسے مجھے بھی دو۔

شہناز نے کبھی اپنے میکے آ کر سسرال کی برائی نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر ایسا کیا تو عارف بھائی کو اور میرے ماں باپ کو بڑی تکلیف پہنچے گی وہ خود پر جبر اور صبر کرتی رہی۔ رافعہ کی عادت یہ تھی کہ روزانہ صبح گھر سے یہ کہہ کر چلی جاتی کہ میں امی جی کے پاس جا رہی ہوں اور شام کو واپس آجاؤں گی۔ عارف جب شام کو گھر نوکری سے تھکا ہارا آتا تو اکثر رافعہ گھر پر نہیں ہوتی تھی۔ عارف اماں جی سے پوچھتا! رافعہ؟ تو اماں جی کہتی کہ وہ اپنی ماں جی کے گھر گئی ہے، عارف خاموش ہو جاتا۔ عارف ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ رافعہ کمرے میں داخل ہوئی اور عارف کو آواز دی۔ عارف چائے لے لیں ٹھنڈی ہو جائے گی۔ عارف اُٹھا اور پلنگ پر ہی اُس نے چائے کا ٹرے رکھ لیا۔

بنیادی طور پر عارف نہایت شریف انسان تھا اُس نے کبھی بھی رافعہ کو یہ احساس نہیں دلایا تھا اور نہ ہی ہونے دیا تھا کہ تمہارا بھائی میری بہن کے ساتھ زیادتی کرتا ہے جب سارے خاندان والوں کو یہ پتا چلا کہ نوید نے دوسری شادی کر لی ہے اور وہ بھی پنڈ دادنخان کے رہنے والے کسی سید گھرانے میں جو کہ جرمنی میں مقیم ہے اور لڑکی وہاں پر ڈاکٹر ہے۔ نوید جو مزید تعلیم حاصل کرنے گیا تھا وہیں پر اس کی ملاقات ہوئی اور ان دونوں نے اپنے گھر والوں سے بناء پوچھے شادی کر لی جس کا علم شہناز اور اس کے گھر والوں کو شادی کے 2 برس کے بعد معلوم ہوا۔ پورے خاندان میں تھرتھلی مچ گئی بڑے بھائی نے عارف سے کہا تم رافعہ کو میکے بھیج دو کیونکہ اس کے بھائی نے ہماری بہن پر سوتن لا کر بٹھا دی ہے اب ہمارا بھی یہ حق بنتا ہے کہ ہم رافعہ کو اس کے میکے بھیج دیں۔ رافعہ زار وقطار روتی تھی اور اپنی نندوں سے معافیاں مانگتی تھی کہ باجی میرا کیا قصور ہے میرے بھائی نے یہ کام کیا ہے مجھے اُس کی سزا کیوں ملے؟ عارف کی بہنیں بھی بہت شریف النفس نہایت سمجھ بوجھ رکھنے والی تھیں انھوں نے بڑے بھائی اماں جی اور اور عارف کو سمجھایا ایسا مت کرنا کوئی بات نہیں نوید نے شرعی کام کیا ہے کوئی غیر شرعی کام تو نہیں کیا تکلیف تو ہمیں بھی ہے، دکھ تو

ہمیں بھی ہے کہ ہم اپنی بہن کے لئے کچھ نہیں کر سکتے مگر اب کیا کریں سگی رشتہ داری ہے اگر کوئی ایسا ویسا قدم عارف بھائی آپ نے اُٹھالیا تو پورا خاندان بکھر جائے گا آپ کے بچے اور شہناز کے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا اور ہم لوگ ساری عمر کے لئے پچھتاوے کا شکار ہو جائیں گے۔

عارف نے بڑی ہمت حوصلے سے رافعہ کو اپنے گھر رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور بڑے بھائی سے معذرت کر لی کہ بھائی جان مجھے یہ سمجھائیں اس میں رافعہ کا کیا قصور ہے ہم اُس کو سزا کیوں دیں؟ بڑے بھائی کچھ دن ناراض رہے مگر پھر خاموش ہو گئے جب بھی وہ عارف کے ہاں آتے تو رافعہ سے خوشی سے بات نہیں کرتے تھے بس اتنا کہا کرتے تھے کہ تیرا میرا رشتہ صرف اور صرف بس اتنا ہی ہے جتنا ایک جیٹھ کا بھابھی سے ہوتا ہے نہ تو میرے چچا کی بیٹی ہے اور نہ ہی تو میرے لئے نوید کی بہن ہے، تو میرے بھائی کے بچوں کی ماں اور میرے بھائی کی بیوی ہے بس، اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ نوید کا پڑھائی میں ابھی ایک سال باقی تھا تو نوید نے شہناز اور بچوں کو اپنے پاس بیرونِ ملک بلانے کے لئے کوشش شروع کر دی جس پر رافعہ بڑی سیخ پا ہوئی اور سرگوشیوں میں اپنی نندوں سے باتیں کرنے لگیں لو جی میرا بھائی تو بہت ہی بُرا ہے دوسری شادی کر لی ہے وہ پھر بھی شہناز کو باہر بلا رہا ہے بچوں سمیت، اور آپ لوگ میری جان نہیں چھوڑ رہے مجھے یہاں رہتے ہوئے کہاں سکھ چین مل رہا ہے؟ عارف کی بڑی بہن نے رافعہ سے کہا ایسے مت کہو ہم نے تمھیں کبھی اپنی بھابھی نہیں سمجھا، ہم نے تمھیں ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے اگر تمھیں پھر بھی کوئی اعتراض ہے تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہم نے ہمیشہ ہر موقعے پر تمھارا ساتھ دیا ہے اپنی بہن شہناز کا ساتھ نہیں دیا اُس کے ساتھ نہیں کھڑے ہوئے محض اس لئے کہ ہمارے بھائی کا گھر تباہ نہ ہو۔

رافعہ زبان کی تو بڑی میٹھی تھی مگر دل کی بڑی کالی تھی اُس نے آہستہ آہستہ عارف کو بہنوں سے متنفر کرنا شروع کر دیا سب سے پہلے اُس نے سب سے چھوٹی بہن عائشہ کے بارے میں اور اُس کے میاں کے بارے میں عارف کو بتانا شروع کیا کہ ارشد تو اچھا نہیں ہے وہ عائشہ کو ہر بات پر ڈانٹتا ہے ٹوکے مارتا ہے، بڑے بھائی جان کو ہمارے گھر کی ساری خبریں دیتا ہے اور عائشہ کے سسرال

میں جاؤ تو میرے پاس آ کر نہیں بیٹھتا اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ باجی رانوں سے پوچھ لیں ۔اس طرح کرتے کرتے رافعہ نے عارف کو اپنی سب سے چھوٹی بہن عائشہ اور بہنوئی ارشد سے دور کر دیا پھر اس کا دوسرا ٹارگٹ عارف کی منجلی بہن شمع تھی جو کہ دوسرے شہر میں رہتی تھی اور اُس کا میاں درزیوں کا کام کرتا تھا کبھی دیہاڑی لگ جاتی تھی اور کبھی نہیں تو شمع کو اکثر و بیشتر اپنے بھائیوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی جو کہ رافعہ کو کسی صورت نہیں بھاتی تھی۔ وہ اکثر اپنے میاں عارف کو کہا کرتی عارف صاحب آپ نے اپنے بہنوں کے بچوں کو ہی پالنا ہے اپنے بچوں کا خیال مت کیجئے گا اور آپ سے یہ خیال ہو گا بھی نہیں۔

اس دوران شہناز اپنے بچوں کو لے کر اپنے میاں نوید کے پاس بیرونِ ملک چلی گئی ،نوید نے وہاں اُس کے لئے علیحدہ گھر لے لیا ایک دن وہ شہناز کے پاس رہتا اور ایک دن اپنی دوسری بیوی کے ہاں مگر شہناز نے اپنے میاں کی دوسری شادی ہونے کے بعد میاں سے اُس طرح کا تعلق ختم کر لیا تھا جو کہ عام میاں بیوی میں پایا جاتا ہے اُس نے زیادہ تر اپنا وقت نمازیں پڑھنے ،قرآن پاک کی تلاوت کرنے اور اپنے بچوں کی نگہداشت پر مرکوز کر رکھا تھا۔ رافعہ کو یہ بھی بہت بڑا دکھ تھا کہ شہناز بیرونِ ملک چلی گئی ہے جب وہ خاندان میں رشتے داروں میں بیٹھی ہوتی تو بڑے فخر سے کہتی !لو جی دیکھو موجیں تو شہناز کی ہیں یورپ میں مزے کر رہی ہے ایسے ہی میرے بھائی کو بدنام کیا آخر اُس نے رکھا ہوا ہے چھوڑا تو نہیں ہے نہ !اور پھر کبھی کبھی اپنی بڑی نند باجی رانوں کو جو کہ لاہور میں رہا کرتی تھیں فون پر بتلایا کرتی ،آپا شہناز تو بڑی عیاشی میں ہے آپ لوگوں نے تو ویسے ہی نوید کو بد نام کر رکھا تھا دیکھ لیں موجیں کر رہی ہے۔ آپا آپ کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتی ہوں اس لئے ایسی باتیں کر رہی ہوں اپنا آپ ہولا کرنے کے لئے۔ بڑی آپا سادہ طبیعت کی مالک تھیں وہ یہ باتیں سچ سمجھ لیتیں اور اپنی ساری باتیں اور شہناز سے کی ہوئی باتیں رافعہ کو بتا دیتیں۔ رافعہ بعد میں انہی باتوں کا بتنگڑ بنا دیتی اور گھر میں فساد شروع ہو جاتا۔ عارف انتہائی شریف النفس انسان تھا، وہ کھل کر نہ اپنی بیوی کو ڈانٹ سکتا تھا نہ اپنی بہنوں سے لڑ سکتا تھا خاموشی سے واش روم میں جاتا اور دس پندرہ منٹ کے بعد بھیگی آنکھوں کے ساتھ تولیوں سے منہ پوچھتا ہوا باہر آجاتا کہتا کہ یار

مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے میں نماز پڑھنے مسجد جا رہا ہوں۔

ان دونوں کی شادیوں کو 20 برس گزر چکے ہیں رافعہ نے بڑی چالاکی اور مکاری سے عارف کو اپنی بہنوں اور بہنویوں سے متنفر کر دیا جب کہ شہناز کے بچے نوید اور شہناز کی سوتن جرمنی میں معمول کی زندگی بسر کر رہے تھے مگر رافعہ ہے کہ اس کے اندر کی کمینگی اور عورت کا ازلی حسد اُسے خاندان کو توڑنے میں ابھی تک مشغول ہے وہی گھر جو کہ آج سے 20 برس پہلے ایک خوبصورت گلشن کی طرح آباد تھا جس میں رنگ رنگ کے پودے پھول اور خوشبو دار رشتوں کی بیلیں ہوا کرتی تھیں اب وہاں بغض، حسد اور نفرت کی دیواروں نے لے لی ہے تھوڑی ہوا ایسی چلتی ہے کہ جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید یہ گلشن پھر آباد ہو جائے مگر جس طرح رافعہ نے اس خاندان کو ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت تقسیم کیا ہے اور مزید تقسیم کرتی جا رہی ہے عارف کو نہیں لگتا کہ وہ اپنے بزرگوں کی روایات کو نبھا سکے گا اور اپنی بہنوں اور بھائی سے پہلے جیسا پیار اور محبت بانٹ سکے گا۔ اچانک عارف اُٹھا اور اُس نے آواز دی رافعہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے

گیان

ساون کی شدید بارش ہو رہی تھی مگر اُس کو ساون کی بارش زیادہ پسند نہیں تھی وہ اکثر کہا کرتا مجھے بھادوں کی بارش بہت پسند ہے تو اُس کی محبوبہ کوثر اُسے کہتی ''تو بھی پاگل ای ایں'' اور خالد ہنس پڑتا اور کہتا ''او جھلیے پاگل ہی ہوں تو تیرے ساتھ عشق کرتا ہوں نا'' کوثر کہتی خالد یہ تو بتا تجھے میرے میں کیا پسند آیا جو میرے ساتھ عشق ہو گیا میں ایک درمیانے درجے کی شکل وصورت والی لڑکی، نہ میں فیشن کرتی ہوں جیسے کہ شہروں کی بیبیاں کرتی ہیں، گلی میں سے وہ جو پھیری والا گزرتا ہے وہ شیشے والے فریم میں سُرمے کاجل لپسٹک اور انگوٹھیاں لے کر اور آوازیں لگاتا ہے آجاؤ لے لو نئے طرز کا میک اپ سستے داموں میں۔ اور میں بھاگتی ہوئی اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی ہو کر پردے کی اوٹ میں اُسے آواز دیتی ہوں اور وہ اپنا شیشے والا فریم سر سے اُتار کر زمین پر رکھ دیتا ہے اور پھر طرح طرح کی چیزیں مجھے دکھانی شروع کر دیتا ہے کہ بی بی جی یہ میں سپیشل لاہور انارکلی سے لایا ہوں یہ آپ کو ادھر گاؤں میں نہیں ملے گا کسی سے۔ میری دیکھا دیکھی میرے محلے کی چند سہیلیاں بھی اُس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں کچھ اُس سے نیل پالشیں خریدتی ہیں جو کہ بڑے برینڈز کے نام کی ہوتی ہیں مگر اصل میں وہ جعلی ہوتی ہیں کیونکہ تیس چالیس روپے میں کوئی بڑے برینڈ کی لپسٹک یا نیل پالش نہیں مل سکتی۔ اُس پھیری والے کے پاس نوجوان لڑکیوں کی ضروریات کی تمام اشیاء موجود ہوتی ہیں اور وہ لڑکیاں بھی اُس پھیری والے سے بلا جھجک اپنی ضرورت کی ہر چیز مانگ لیتی ہیں اور اُس کے دام بھی بے دھڑک ہو کر پوچھتی ہیں۔ وہ پھیری والا بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اُن کی کوئی پرانی سہیلی ہو۔

یہ پھیری والا کئی برسوں سے آ رہا ہے اور کوثر کہا کرتی ہے کہ میری ماں بھی اس پھیری والے سے اپنی ضروریات کی چیزیں لیا کرتی تھی۔ خالد نے ہنس کر کہا پھر تو اُس پھیری والے کے بڑے مزے ہوتے ہوں گے؟ کوثر نے شرما کر کہا ہٹ بے شرم کیسی باتیں کرتا ہے تجھے شرم نہیں آتی تیرے گھر ماں بہنیں نہیں ہیں؟ اور پھر دونوں ہنسنے لگ پڑے۔ کوثر نے خالد سے پوچھا میرا ہاتھ مانگنے اپنی

اماں کو کب ہمارے گھر بھیجے گا؟ خالد نے شرارتاً ماحول بناتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہا تجھے بڑی جلدی ہے بھیج دوں گا کیا ہو گیا ہے میں کوئی بھاگا تو نہیں جا رہا۔ کوثر کے منہ سے بے ساختہ نکلا اگر میں بھاگ گئی تو؟ خالد نے کہا چل جھوٹی تجھے میرے جیسے دیوانے کے سوا کون قبولے گا؟

بھادوں کی جھڑی زوروں پر تھی خالد اور کوثر یہ تمام باتیں اپنے موبائل فون سے کر رہے تھے ساجدہ نے خالد سے کہا ''خالدی میرے موبائل کی بیٹری ختم ہونے والی ہے اگر فون بند ہو جائے تو یہ نہ خیال کرنا کہ میں نے فون خود بند کیا ہے اور پھر کہیں بے چین ہو کر جیسے کہ حسب معمول تمہاری عادت ہے جب ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو ہماری گلی کے چکر کاٹنے لگ جاتا ہے خدارا آج ایسے نہیں کرنا بارش میں بھیگ جاؤ گے ہمارے گلی میں پانی بھی بہت زیادہ جمع ہو چکا ہے اور میرے بھائی بھی گھر پر موجود ہیں اور میں یہ سب باتیں اُن سے چھپ کر باورچی خانے میں لائٹ بند کیے ہوئے بیٹھ کر کر رہی ہوں۔'' خالد ہنسا بزدل پیار کرتی ہے اور ڈرتی ہے دنیا سے لگتا ہے تیرا پیار سچا نہیں ہے۔ کوثر کو غصہ آ گیا، تُو کیا چاہتا ہے میں سوہنی کی طرح کچے گھڑے پر تیر کر ڈوب جاؤں یا صاحباں کی طرح اپنے سوہنے مرزے کے تیر توڑ دوں یا ہیر کی طرح کھیڑے کے ساتھ شادی کر لوں خالد تیرے میں اپنے کان چھدوانے کی ہمت ہے، کیا تو میرے عشق میں سادھو بن سکتا ہے مجھے امتحان میں نہ ڈالا کر عشق قربانی مانگتا ہے میرا اعتبار کر مجھے آزمائش میں مت ڈال کوثر کو اتنا پتا ہے اُس نے جس سے پیار کیا ہے وہ خالد ہے خالد کبوتر باز جو پانچویں کلاس سے سکول سے بھاگا اور پھر کبوتر بازی کرنے لگ گیا مجھے پتا ہے خالد تو نے کئی لڑکیوں سے عشق لڑائے ہیں اور میرے سے بہت سوہنی سوہنی لڑکیوں سے، ارے تجھے مجھ میں کیا نظر آیا؟ میں تو موٹے نقشوں والی سانولی رنگت لئے ہوئے ایک دن اچانک تیرے سامنے آ کھڑی ہوئی وہ دن اور آج کا دن ہم دونوں دو جسم اور ایک روح بن گئے لیلیٰ اور مجنوں کی طرح نہیں کہ بچپن میں لیلیٰ کو سبق نہ پڑھنے پر مار پڑتی تھی تو نشان مجنوں کے بدن پر پڑ جاتے تھے ہمارا عشق سچا کھرا اور خالص ہے بالکل ہمارے گھر میں پر وہلے میں پڑی ہوئی گندم کے دانوں کی طرح۔ اچھا خالد اب میں فون رکھتی ہوں لگتا ہے کوئی آ رہا ہے اور ویسے بھی میرے فون کی بیٹری بالکل کم رہ گئی ہے۔ خالد دوسری طرف

سے آواز لگا رہا تھا او بات تو سن بات تو سن ۔مگر دوسری طرف سے فون بند ہو گیا خالد اپنے عشق کی سرشاری میں گلی میں آ گیا اور بھادوں کی بارش میں نہانے لگ پڑا۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ بھادوں کی جب بارش شروع ہوتی ہے تو لگاتار شروع ہوتی ہے اور جب تک بادلوں میں سے پانی کا آخری قطرہ تک نہ برس جائے وہ تھمتی نہیں ہے اور پھر اگلے دن اُسی ٹائم پر دوبارہ یہ بارش شروع ہو جاتی ہے ۔یہی حال خالد کے اندر کا تھا اُس کے اندر بھی پیار کی محبت کی عشق کی بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی جب تک اس جھڑی کے آخری قطرے نے برسنا نہیں تھا خالد کو چین نہیں آ رہا تھا، بھیگے کپڑے لئے خالد جب گھر میں داخل ہوا تو اُس کی بہن رضیہ نے پوچھا بھئی کیا ہوا بارش میں اتنا زیادہ بھیگ گئے کسی شیڈ کے نیچے رک جاتے بارش کے رکنے کا انتظار کر لیتے آپ نے تو اپنے آپ کو بھگو لیا ہے خدانخواستہ کہیں بخار نہ ہو جائے ۔مگر خالد ان سب باتوں سے ماورا کوثر کے عشق میں مبتلا اُس کی باتوں کے نشے میں چور چور اُس کو ابھی تک اپنے قریب محسوس کر رہا تھا۔اُس نے کہا ارے نہیں پگلی ایسی بارش میں نہانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے میں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اس بارش کے حوالے کیا ہے اور دیکھنا کل پھر اسی وقت یہ بارش اسی طرح برسے گی اور میں پھر بھیگوں گا اور جنگل میں موڑ کی طرح ناچوں گا۔رضیہ نے کہا جنگل میں موڑ ناچتے ہوئے کس نے دیکھا ہے اور ہمارے گاؤں میں دور دور تک کوئی موڑ نہیں پائے جاتے جنگل میں موڑ ناچا کس نے دیکھا بھیا۔مگر خالد جو کہ اپنی دھن کا پکا تھا اپنے عشق کے خدا کا سچا پجاری تھا وہ کب یہ باتیں ماننے والا تھا جب شام کو بارش رُکی تو خالد کوثر کے محلے میں جو کہ خالد کے گھر سے کچھ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اُس کے گھر کے قریب سے سر جھکائے ہوئے گزر رہا تھا خالد اس عمل کو بھی اپنے عشق کی عبادت سمجھتا تھا بھلے محبوب دیکھے نہ دیکھے مگر یہ اُس کا معمول تھا کہ وہ کوثر کی گلی سے دن میں ایک دفعہ ضرور گزرتا تھا سر جھکائے ہوئے نگاہیں زمین میں گاڑے ہوئے دُنیا و مافیا سے بے خبر بس کن اکھیوں سے اپنے محبوب کے در کی چوکھٹ کا نظارہ کرتا اور دور ہی دور سے اُس سے بالکل اس طرح سے دیکھتا جیسے کوئی خانہ کعبہ میں ہجر اسود کی زیارت کر رہا ہو مگر اُسے قریب جا کر چھو نہ سکتا ہو۔

خالد کی اس حالت کو اُس کے دوست بھی جانتے تھے مگر کبھی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ خالد سے پوچھے کہ یار یہ تو کیسا عشق کرتا ہے کبھی تو نے اپنے محبوب کو روبرو بٹھایا، دیکھا بھی کبھی اُسے چھوا بھی ہے یہ کیا دیوانہ پن ہے؟ اکثر اُس کے دوست اُس سے پوچھا کرتے اُس کا مذاق اُڑایا کرتے تو وہ ہنس دیتا پاگلو سچے عشق میں کبھی کسی نے اپنے محبوب کو دیکھا ہے اُسے تو محسوس کیا جاتا ہے اپنی روح میں اپنی شہ رگ سے قریب ،تم لوگ کیسے عاشق ہو مادہ پرست گوشت پوست کے محبوب کی تلاش مین ،او یہ عشق نہیں ہوتا ایسا یہ حوس پرستی ہوتی ہے اور یہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتی عشق سچا وہی ہے محبوب سچا وہی ہے درسچا وہی ہے جو کہ نظر نہ آئے اور محسوس بھی ہو پاگلو تم لوگ کیا جانو عشق کی پیڑ کو یہ ہر بندے کا کام نہیں ہے یہ اُس کی عطا ہوتی ہے وہ جس پر کردے تم لوگ ڈنگر چرانے والے کیا جانو اپنے محبوب سے کس طرح ملا جاتا ہے اُسے کتنی عزت اور تقریم دی جاتی ہے محبوب کے ظاہری حسن کو نہیں دیکھا جاتا اُس کے باطنی حسن اور سیرت کو پوجا جاتا ہے اور اس کے لئے اپنے اندر کا کھوٹ کمینگی کو مارنا پڑتا ہے یہ کام کوئی اتنا آسان نہیں ہے اس کام کو کرنے کے لئے ایک عمر چاہیے مگر تم کیا جانو تم لوگ دُنیا داری کی دلدل میں پھنسے ہوئے لوگ جنسی خواہشوں کے مارے ہوئے کمینے لوگ ہو۔او پاگلوں عشق اور سچا عشق تو بوڑ کے درخت کی طرح ہوتا ہے جس کے سائے کے نیچے بہت سے لوگ پناہ لیتے ہیں اور وہ بوڑ کا درخت گرمیوں میں اُنھیں ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے اور سردیوں میں نگی دھوپ جس میں لوگ بیٹھ کر مزے سے حقہ پیتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں چھوٹی موٹی لڑائیاں کرتے ہین اور بچے کبھی اُس بور کے درخت کی شاخوں کو پکڑ کر جھولے لیتے ہیں۔او پاگلوں عشق یہ ہوتا ہے جو اُس کے نیچے بیٹھے اس کو بھی گیان مل جاتا ہے۔خالد اپنے دوستوں کو عشق کے رموز بتا رہا تھا کہ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے خالد کے پاس آئے اور اُس سے کہا خالد تجھے پتا ہے کہ کوثر احسان ماجرے والے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔۔۔

غدار

31 جنوری 1996ء کا دن تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایف ایٹ مرکز میں، میں اپنے دفتر کے ہیڈ آفس میں Joining دے رہا تھا Joining دینے کے بعد مجھے ایڈمنسٹریشن میں شامل کرلیا گیا اور میری پوسٹنگ 14L ایف ایٹ مرکز کی ایک بلڈنگ میں کردی گئی۔ میرے ایڈمن چیف نے اپنے نائب قاصد کو بلایا اور اُسے کہا کہ ان صاحب کو آر اینڈ آئی سیکشن 14L میں لے جاؤ۔ نائب قاصد نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا، آئیں صاحب جی۔ دیکھنے میں وہ نائب قاصد مجھے ایک غنڈہ سا لگا، جس کی بڑی بڑی موچھیں تھیں، گھنے بال تھے جن میں سرسوں کا تیل بھرا ہوا تھا، گلے میں ایک مفلر تھا جو کہ چھوٹے چھوٹے ڈوٹس والا ریشمی کپڑے کا بنا ہوتا ہے۔ اکثر آپ نے ایسے مفلر بہت سے لوگوں کے پاس دیکھیں ہوں گے، وہ مجھ سے دو قدم آگے چل رہا تھا، میں پیچھے پیچھے خاموشی سے سر نیچا کیئے چل رہا تھا۔ اتنے میں 14L بلڈنگ آگئی جو کہ ایف ایٹ مرکز میں ہی تھی اُس کی پہلی منزل میں وہ مجھے لے گیا، سیڑھیاں چڑھ کر بائیں طرف وہ مڑا اور تین چار قدم چل کر بائیں ہاتھ کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اُس کمرے کے باہر بڑے بڑے حروف میں R&I سیکشن لکھا ہوا تھا، دروازہ کھولتے ہی اُس نے کہا، احترام صاحب یہ ایک اور صاحب آگئے ہیں اِنھیں متین صاحب نے بھیجا ہے Joining اِن کی ہوگئی ہے اور Joining کی کاپی اِن کے پاس ہے صاحب جی چیک کرلیں۔

میں سہما سہما کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں 7 ٹیبل لگے ہوئے تھے، کمرے کے درمیان میں جو ٹیبل تھا وہ احترام صاحب کا تھا، اُنھوں نے مجھے بڑی تنقیدی نظروں سے دیکھا اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا بیٹھیں، میں اُن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اُنھوں نے پوچھا کہ پہلے کہیں کام کیا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں 6 برس تک ڈاک خانے میں کام کیا ہے، اُنھوں نے کہا کہ چلو تم ٹھیک جگہ پر آگئے ہو اور اپنے دائیں طرف بیٹھے ہوئے صاحب کو آواز دی، خالد۔۔۔ اِن کو اپنے ساتھ کام پر بٹھالو۔ میں اُٹھا، خالد نے مجھے کہا آپ کا نام؟ میں نے کہا زاہد، اُس نے کہا زاہد صاحب آئیں بیٹھیں یہاں آکر۔ میں خالد کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کمرے میں

خاموشی رہی، پھر خالد مشتاق نے باقی سٹاف کے لوگوں کے ساتھ میرا تعارف کروایا۔ خالد کے بالکل سامنے والے ٹیبل پر نیاز علی بیٹھتا تھا جو کہ پٹھان تھا، نیاز کے ساتھ والے ٹیبل پر ایک اسٹنٹ تھا جس کا نام بشیر احمد تھا۔ بشیر کے دائیں ہاتھ پر جو ٹیبل تھا اُس پر ڈی آر بیٹھا کرتے تھے، ڈی آر یعنی کے ڈاک رائیڈر، ایک شفیق صاحب جو کہ ریٹائرڈ فوجی تھے، اور ایک ظفر صاحب۔ سیکشن میں چار نائب قاصد تھے جو کہ ہر ایک اسٹنٹ کے ساتھ Attach تھے، اُس سیکشن میں چار اسٹنٹ دو جونیئر ایڈمن اسٹنٹ دو ایل ڈی سی، دو ڈی آر، چار نائب قاصد اور ایک سپرینٹنڈنٹ احترام الدین صدیقی صاحب تھے۔

چند دن میں میری تمام سٹاف کے لوگوں سے دوستی اور اچھی Understanding پیدا ہوگئی، میں بھی جونیئر ایڈمن اسٹنٹ تھا، اور ایک اور جونیئر ایڈمن اسٹنٹ جس کا نام احمد شاہ ویز تھا وہ میرے بڑے بھائی کا دوست نکل آیا۔ خالد مشتاق کا تعلق اوکاڑہ سے تھا، یہ ایڈمن اسٹنٹ تھا، نیاز علی کا تعلق نوشہرہ سے تھا پٹھان تھا وہ۔ بشیر احمد کا تعلق بجوات (سیالکوٹ کے سرحدی گاؤں سے تھا) اور ایک اسٹنٹ راجے شاہ تھا جس کا تعلق جھنگ سے تھا۔ میرا تعلق گجرات سے تھا۔ سیکشن کا ماحول بالکل ایسے تھا جیسا کہ ایک کلاس روم کا ہوتا ہے کیونکہ احترام الدین صدیقی جو کہ سپرنٹنڈنٹ تھے ڈسپلن کے بہت پابند تھے اگر کسی کو کبھی چھٹی لینا پڑ جاتی تو اُسے پہلے دو تین دن سوچنا پڑتا کہ میں کیسے اُن سے بات کروں، کسی کو زیادہ فری نہیں ہونے دیتے تھے۔ سیکشن میں ایک ٹیلی فون تھا اور اُس کو استعمال کرنے کی اجازت سٹاف کو نہیں تھی، اگر کبھی سٹاف میں سے کسی کے رشتہ دار کا فون ایک سے دوسری بار آجاتا تو اُسے احترام صاحب سے ڈانٹ پڑتی، اور احترام صاحب کہتے، بھائی یہ کوئی ٹیلی فون ایکسچینج نہیں ہے۔

R&I ایک چھوٹا سا ڈاکخانہ تھا جہاں پر پورے ادارے کی ڈاک آیا کرتی تھی اور اُسے ریسو کیا جاتا تھا، اُس میں کوریئر سروس والے، پوسٹ آفس والے، یو ایم ایس والے، بائی ہینڈ ڈاک لانے والے، تمام لوگ R&I میں آیا کرتے تھے اور R&I میں ایک ایل ڈی سی کو اس لئے بٹھایا گیا تھا کہ وہ یہ تمام ڈاک ریسیو کرے اور پھر متعلقہ جو چار اسٹنٹ تھے اُن کے ٹیبلوں پر پہنچائے،

ٹیبلوں پر پہنچانے کا طریقہ یہ رکھا گیا تھا کہ جو ایل ڈی سی ڈاک ریسیو کرتا تھا اُس کی پشت پر ایک بڑے پجن ہول بنے ہوئے تھے جن میں وہ چار اسسٹنٹ کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اُن ناموں کے مطابق وہ ڈاک اُن خانوں میں پھینک دی جاتی تھی، ایک خانے میں جی پی او اور فیلڈوں کی ڈاک جمع کی جاتی تھی، ایک خانے میں ایم ڈی ای ڈیس اور چیئر مین کی ڈاک رکھی جاتی تھی، ایک خانے میں جی ایم اور منیجرز کی ڈاک رکھی جاتی تھی اور ایک خانے میں اکاؤنٹ اور آڈٹ والوں کی ڈاک رکھی جاتی تھی۔ سارا دن یہ ڈاکیں جمع ہوتی رہتی تھیں اگلے دن ہم لوگ آ کر اپنے اپنے خانوں میں سے ڈاکیں نکال کر فلو روائز سارٹ آوٹ کرتے تھے، اور پھر اُنھیں رجسٹر ڈ پر چڑھا کر ڈائری نمبر پر لگا کر اپنے نائب قاصد کو دے دیا کرتے تھے جو کہ مختلف سیکشن میں جا کر ڈاک ریسیو کرواتا تھا۔

نیاز علی خان جو کہ پٹھان تھا، اِس لئے ہم سب اُس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ہمارے سیکشن میں زیادہ پنجابی تھے صرف احترام صاحب کراچی سے تعلق رکھتے تھے اُردو بولتے تھے اور نیاز پٹھان تھا اُسکا تعلق نوشہرہ میں ایک موچی خاندان سے تھا وہ ایم اے پشتو کر کے سیاسی طور پر ہمارے ادارے میں بھرتی ہوا تھا، وہ اکیلا نہیں تھا اُس جیسے بے شمار ایم اے اور بی اے پاس سیاسی طور پر ہمارے دفتر میں بھرتی ہوئے تھے۔ میں جب R&I میں آیا تو یہ تصور کیا گیا کہ میں بھی سیاسی طور پر بھرتی ہوا ہوں مگر ایسا نہیں تھا، میں غیر سیاسی طور پر آیا تھا اور Through Proper Channel آیا تھا۔ جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا کہ نیاز کا تعلق معاشی طور پر ایک موچی خاندان سے تھا اور اُس کو یہ بتانے میں کوئی شرم اور آر محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ موچی کا بیٹا ہے، اُس میں خان غفار خان سے شدید محبت رچی بسی تھی وہ باچا خان کو اپنا سب کچھ تصور کرتا تھا ولی خان اور بیگم نسیم ولی خان کا بہت احترام کرتا تھا۔ اُسے فخر تھا کہ وہ سرخ رنگ کی ٹوپی پہنتا ہے اور ایک پختون ہے اپنے علاقے، زبان اور اپنی پارٹی (عوامی نیشنل پارٹی) سے جنون کی حد تک جڑا ہوا تھا۔ ہم سارے پنجابی اُسے، اُس کی پارٹی اور اُس کی لیڈر شپ کو "غدار" کہا کرتے تھے، اِس پر وہ چڑ جاتا کبھی کبھی ناراض ہو جاتا اُس کو یہ گلا تھا کہ آپ پنجاب والے کے پی کے اور اُس کی آبادی کو پسند نہیں کرتے

پٹھانوں سے دوستی رکھتے ہیں نہ رشتے کرتے ہیں پٹھانوں کو گندا اور بُرا سمجھتے ہیں۔ اِس پر طرہ یہ تھا کہ وہ ایک محنت کش موچی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ بتایا کرتا تھا کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کی دکان پر بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر جوتیاں بنائی ہیں مگر ہمارے پنجابی ذہنیت رکھنے والے ساتھیوں نے اِس بات پر بھی اُس کا تمسخر اُڑایا اور اُسے اور زیادہ کمتر اور گھٹیا سمجھنے لگ پڑے، مگر مجھے نیاز علی سے کوئی ایسی نفرت یا بغض نہیں تھا بلکہ ہم دونوں دوست بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی ہم دونوں دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا کرتے تھے، اُن دنوں پندرہ روپے میں ایک سبزی کی پلیٹ اور چار روٹیاں مل جایا کرتی تھیں اور ہم دونوں مل کر لنچ کیا کرتے تھے، ایک دن پیسے وہ دیتا ایک دن پندرہ روپے میں دیا کرتا تھا۔ اِسی طرح گرمیاں، سردیاں، خزاں بہار آتے جاتے رہے نیاز کی شادی ہوگئی، 1998ء میں ہمارا آفس ایف ایٹ سے تبدیل ہو کر بلیو ایریا چائنہ چوک آگیا، یہاں 20 منزلہ نئی عمارت میں ہمارا سیکشن R&I ایل جی پر قائم ہوا (لور گراؤنڈ)۔

میری اور نیاز کی دوستی مزید پکی اور مضبوط ہوتی گئی مجھے پشتو ادب سے لگاؤ تھا میرا پسندیدہ شاعر غنی خان تھا جس کی شاعری نیاز علی مجھے پڑھ پڑھ کر سُناتا اُس کا ترجمہ بھی بتاتا کہ یار دیکھ یہ کتنا بڑا شاعر ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ رحمان بابا، خوشحال خان خٹک کے بعد اگر کوئی سب سے بڑا پشتو کا رومانوی اور صوفیانہ شوق رکھنے والا شاعر ہوا ہے تو وہ غنی خان ہے مگر غنی خان باچا خان کا بیٹا تھا اِس لئے ہمارے پنجابیوں کے مطابق یہ سب غدار تھے، اور غدار ہیں۔ اِس بات کی وکالت نیاز علی ہمیشہ یوں کرتا تھا کہ نہیں ہم لوگ غدار نہیں ہیں ہم نے اپنے ملک کی حمایت کی ہے اپنے لوگوں کے ساتھ وفاداری ضرور کرتے ہیں مگر آپ لوگ یعنی کے اہل پنجاب جو ہیں اُنھوں نے ہمیشہ شمال سے آنے والے بہت سے حملہ آوروں کو پناہ دی اُن حملہ آوروں نے پورے برصغیر پر قبضہ کرلیا، اگر اہل پنجاب بقول نیاز علی کے تھوڑا سا مقابلہ کرتے اور اِن حملہ آوروں کو روک لیتے تو شاید برصغیر کی صورت حال کچھ اور ہوتی۔ کیونکہ اُس نے ایم اے پشتو کیا ہوا تھا اُس کو اپنے مضمون پر پوری دسترس حاصل تھی، مگر ہم ایک ہی بات کرنا جانتے ہیں وہ یہ کہ لوگوں کا دل دُکھانا، اُن کی بے عزتی

کرنا، خود کو برتر خیال کرنا، یہ وہ عادات اور طریقے تھے جو نیاز علی کو غصہ دلاتے تھے وہ کبھی خالد مشتاق سے جھگڑا کر رہا ہوتا، کبھی بشیر سے کبھی احمد شاویز سے اور کبھی راجے شاہ سے۔ مگر میں اُس کے ساتھ ہمیشہ درمیان کا راستہ اختیار کرتا وہ مجھے مخاطب کر کے کہتا، زاہد بتا تو اِن کو میں ٹھیک بات کر رہا ہوں کہ غلط۔ میرا نیاز علی اُس کی پارٹی اور اُس کے لیڈروں سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا بلکہ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہ تصور کرتا تھا کہ اگر برِّصغیر میں سیاسی طور پر کوئی قائداعظم اور نہرو خاندان کے بعد بڑا سیاسی خاندان ہے تو وہ باچا خان کا خاندان ہے جس پر اکثر میرے پنجابی دوست مجھے کہا کرتے، زاہد تو پٹھان سے ڈرتا ہے اس لئے کھل کر بات نہیں کر سکتا۔ مگر ایسا نہیں تھا، نیاز علی زبان کا سخت تھا مگر دل کا صاف اور کھرا تھا اُس میں منافقت نہیں تھی اِس لئے وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔

دسمبر کا مہینہ آگیا اور اے سی آر آ گئیں، اے سی آر احترام صاحب نے لکھنی تھیں اُنھوں نے تمام پنجابیوں کی اے سی آر Good / Very Good کر دیں مگر نیاز علی خان کی اے سی آر Average کر دی۔ یہ بات ہمیں اُس وقت پتا چلی جب باقی ساتھوں کی پروموشن ہوگئی مگر نیاز کی پروموشن نہ ہو سکی، جب اُسے پتا چلا تو وہ بچوں کی طرح دھاڑیں مار کر رونے لگ پڑا اور میرے میرے گلے لگ گیا کہ زاہد کیوں ایسا کیا احترام صاحب نے، میں نے اُن کا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے اُس سے صرف اتنا کہا روح اللہ بہتر کریگا یہ دُنیاوی اے سی آر سے تو کیوں ڈر گیا ارے پاگل میں تو اِس کو کہتا ہی Annual Confidential Revenge ہوں، تو فکر نہ کر دُعا کر کہ ہم سب کی اے سی آر جو اللہ کے ہاں لکھی جا رہی ہے اُس میں پاس ہو جائیں یہ دُنیاداری کچھ بھی نہیں ہے۔ آج میں نیاز علی سے جُدا ہو رہا ہوں کیونکہ ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ گیا ہے میں 60 برس کا ہو چکا ہوں اور سرکاری طور پر میں کسی بھی کام کا اہل نہیں رہا۔ نیاز نے مجھے ایک بار پھر بھرپور جپھی ڈالی اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولا، یار آج بھی تیری جیب میں 100 روپیہ ہی ہوتا ہے جو کہ بھابھی تجھے ہفتے کا دیا کرتی ہیں۔ میں نے قہقہہ لگایا اور کہا، نہیں نیاز اب 100 روپیہ 500 روپے میں تبدیل ہو چکا ہے کیونکہ مہنگائی بڑھ چکی ہے۔-----

گھر کا ماحول

ماں سہمی ہوئی بیٹی ہے کمرے میں بیٹی قریب بیٹھی ہوئی ہے خاموش چپ چاپ اچانک والد کمرے میں داخل ہوتا ہے

والد: یہ تمہارے بیٹے کا رزلٹ آگیا ہے تمھیں تو پتا چل چکا ہوگا بیگم؟

ماں: ہاں، نہیں، ہاں جی، جی بس پتا چل گیا ہے۔

والد: یہ تمہارے لاڈ پیار کی وجہ سے ہوا ہے تم نے اُسے حد سے زیادہ سر پر چڑھا رکھا ہے اور آج یہ جو چوتھے سمسٹر کا رزلٹ آیا ہے اس کے بعد تمہارا برخوردار فرماتا ہے کہ میں نے جیوفزکس نہیں پڑھنی۔ بیگم، مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ میں نے چار سمسٹر کی فیسیں دی ہیں جو کہ ضائع ہوگئی ہیں مجھے افسوس اُن دو برسوں کا ہے جو ہمارے بیٹے نے ضائع کر دیئے ہیں اور یہ دو برس دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ماں: ناصر کوئی بات نہیں اس میں بھی شاید اللہ کی کوئی رضا شامل ہوگی آپ اس کو دل پر مت لیں سب خیر ہو جائے گی

والد بولتا ہے غصے میں: حد کرتی ہو تم کیسی باتیں کر رہی ہو دو برس سات سو تیس دن اس نے مجھے پنی زندگی سے پیچھے کر دیا ہے اور تم جانتی ہو کہ میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے اور پاکستان میں رہتے ہوئے پیسہ کمانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تمہارا بیٹا فرماتا ہے کہ اس نے اب دوسری یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے یہ 21 برس کا ہو چکا ہے اب اس کو یاد آیا ہے۔

اب بیٹی بولتی ہے: ابو جی! آپ فکر نہ کریں بھائی اپنی پڑھائی مکمل کر لے گا وہ لائق ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ نئی یونیورسٹی میں جائے گا تو انشاءاللہ آپ کو اچھا رزلٹ دے گا، اُسے ایک

موقع دے دیجئے ابو جی۔ بس آخری موقع اب وہ اپنی پڑھائی دھیان سے کرے گا۔

باپ بولتا ہے: بیٹا رابعہ! کاش یہ بھی تمہاری طرح میری بیٹی ہوتا۔ بیٹیاں ماں باپ کو کبھی دکھ نہیں دیتیں ہمیشہ بیٹے ہی دکھ دیتے ہیں اور جو گھاؤ جواد نے مجھے دیا ہے شاید میں زندگی بھر اسے برداشت نہ کر سکوں۔

اتنے میں کمرے میں بیٹا داخل ہوتا ہے اور وہ سب کے چہروں کی طرف دیکھتا ہے اور بولتا ہے، آج کچھ کھانا ملے گا؟ امی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

ماں اک دم اُسے غصے کی نظر سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے، جاؤ رابعہ بھائی کے لئے روٹی لے آؤ کچن میں سے۔

بہن بھاگتی ہوئی جاتی ہے اور کہتی ہے، جی امی! میں ابھی لائی۔

کمرے کا ماحول سوگوار رہتا ہے، باپ بیٹے کی طرف کمر کر کے کھڑا ہو جاتا ہے اور ماں آنکھوں میں آنسو لئے چپ چاپ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔

بیٹا کہتا ہے، ابو جی! میں نے نئی یونیورسٹی کا پتا کیا ہے اور کل میں وہاں سے پروسپیکٹس لے کر آؤں گا اور ہاں امی! مجھے صبح جلدی اُٹھا دینا۔

باپ بیٹے کی بات کا جواب نہیں دیتا اور بہن اتنے میں کچن سے کھانا لے کر آجاتی ہے اور بھائی وہ کھانا لے کر کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔

غسل

ہم چند دوست روزانہ شام کو ایک خاص مقام پر اکٹھے ہوا کرتے تھے وہ جگہ تھی ہمارے دوست اسد کی کیسٹوں کی دُکان، یہ وہ دور تھا جب ٹیپ ریکارڈر نیا نیا پاکستان میں متعارف ہوا تھا اور ہر گلی، محلے میں کیسٹوں کی دُکانیں ہوا کرتی تھیں جہاں پر نہ صرف ہر قسم کے فلمی گانوں کی کیسٹیں ملا کرتی تھیں بلکہ وی سی آر، ٹی وی اور ویڈیو فلمیں بھی کرائے پر ملا کرتی تھیں۔

ہم چار پانچ دوست شام کو اسد کی دُکان پر جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور اپنی مرضی کی کیسٹ نکال کر دُکان کے ڈیک پر لگا دیا کرتے اور آواز بلند کر دیا کرتے پورے بازار میں گانے گونجنا شروع ہو جایا کرتے، کبھی چترا جگجیت کی غزلیں سنتے کبھی لیٹیسٹ Sonic کا نمبر آیا ہوتا جس میں انڈین فلموں کے نئے گانے ریکارڈ ہوتے وہ لگا دیا کرتے اور پھر چائے منگوانے کے لئے پرچی ڈالی جاتی۔ پرچی میں جس کا نام آتا وہ پھر چار پانچ کپ چائے کے منگواتا جس کے پاس سگریٹ ہوتی وہ سب کو سگریٹ بھی پیش کرتا، کچھ دوست سگریٹ نہیں پیا کرتے تھے وہ ہمیں سگریٹ پینے پر بہت لیکچر دیا کرتے اُس وقت آتش جوان تھا اور سگریٹ پینا وہ بھی گھر والوں سے چوری، کسی ہیرو گیری سے کم کام نہیں تھا۔

ایک دن ہم دوست بیٹھے ہوئے تھے گپ شپ چل رہی تھی، اسد نے عاکف سے پوچھا یار کبھی کسی لڑکی کو ہاتھ لگایا ہے؟ ہم سب نے قہقہہ لگایا اور عاکف کی طرف دیکھنے لگ پڑے، عاکف تھوڑی دیر کے لئے رُکا پھر جب وہ بولنے لگا تو ایک گاہک آ گیا۔ اُس نے کہا نصرت فتح علی خان کی (پنجابی کیسٹ ہے وے قوالی دی) تب نصرت فتح علی خان، نصرت فتح علی خان نہیں بنے تھے اکثر شام کے وقت مزدور پیشہ لوگ جب اپنی دیہاڑی لگا کر اسد کی ساتھ والی دکان پر آ کر جو کہ ایک

حلوائی کی دکان تھی وہاں سے ایک پاؤ دودھ کا پیالہ پیتے جلیبیوں کیساتھ تو وہ آکر پوچھا کرتے کہ نصرت فتح علی خان کی قوالیوں والی کوئی نئی کیسٹ آئی ہے تو دے دیں۔ اُس وقت نصرت فتح علی خان کی قوالیوں کی کیسیٹیں کسی بڑی میوزک کمپنی کی طرف سے ریلیز نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ چھوٹی دو نمبر کمپنیاں اُن کی کیسٹیں ریلیز کیا کرتی تھیں مگر جب ہم اُنھیں وہ کیسٹ دینے سے پہلے ڈیک میں لگا کر ٹرائی کرواتے تو میں سوچتا کہ یار یہ آواز تو بڑی اچھی ہے یہ قوال تو بڑا اچھا ہے۔ کیسیٹ ٹرائی کرنے سے پہلے ہم گاہکوں سے کہتے، بھئی جی کیسٹ تب کھولیں گے جب آپ نے لینی ہے اُس پر ایک کور لپٹا ہوتا تھا اگر آپ نے یہ نہیں لینی تو ہم یہ کور نہیں کھولیں گے ریکارڈنگ میں کوئی مسئلہ ہوا تو ہماری ذمہ داری نہیں ہے آپ کو یہ لینی پڑے گی۔ گاہک کہتے ٹھیک ہے باؤ جی، آپ لگا لیں ہم خرید لیں گے۔ اُس وقت کیسٹ کی قیمت 20 روپے ہوا کرتی تھی اور اسد یہ کیسیٹیں مغل سرائے راجہ بازار سے لایا کرتا تھا۔ گاہک کیسیٹ لے کر چلا گیا جب گاہک کیسیٹ لے کر چلا گیا تو ہم پھر عاکف کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہاں عاکف بتا یار پھر کسی لڑکی کو کبھی چھیڑا ہے؟ تو وہ پھر مسکرانے لگ پڑا، اُس نے کہا ہاں! ایک دفعہ ایسا موقع ملا تھا مجھے زندگی میں، ہمارا گھر چھوٹا ہے اُس کے دو کمرے ہیں ایک کمرے میں میرے امی ابو سوتے ہیں اور ایک کمرا جس میں دو پلنگ تھے ایک پر میں سوتا تھا اور ایک اکثر خالی رہتا تھا کبھی کوئی مہمان آجاتا تو وہ اس پر آرام کرتا تھا، ایک دن میری ایک کزن ہمارے گھر ملنے کے لئے آئیں میری ماں کے بے حد اصرار پر وہ ایک رات ہمارے ساتھ رہنے کے لئے تیار ہوگئیں گو وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں وہ کوئی تیس برس کے لگ بھگ ہوں گیں خوبصورت تھیں میں اُس وقت پانچویں میں پڑھتا تھا۔

ہم سارے دوست بڑے انہماک سے عاکف کی بات سن رہے تھے ہمارے تجسس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، میں نے پھر عاکف سے پوچھا، پھر کیا ہوا؟ عاکف نے کہا پھر یہ ہوا کہ میری ماں نے کہا کہ عاکف بچہ ہے نسرین تو ساتھ والے پلنگ پر سو جا یہ چھوٹا تیرے ساتھ والے پلنگ پر سو جائے گا رات کو جب ہم سب اپنے اپنے بستروں میں گھس گئے بتیاں بند کر دی گئیں تو میرے اندر نہ چاہتے ہوئے ایک کھلبلی سی شروع ہوگئی۔ نسرین پلنگ پر میری طرف پاؤں کر کے لیٹ گئی ابھی

بمشکل لیٹے ہوئے ہمیں دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں سویا ہوا ہوں اور گہری نیند میں ہوں، میں نے اپنا ہاتھ نسرین کے پاؤں پر رکھ دیا صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ ناراض ہوتی ہے یا کہ خاموش رہتی ہے۔ میری اس حرکت پر اُس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا میری ہمت تھوڑی اور بڑھی میں نے اُس کے پاؤں پر اپنی انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اور اپنے ہاتھ کو اُس کے ٹخنوں تک لے گیا پھر میرا ہاتھ اُس کی پنڈلیوں تک آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا گیا اُس کی پنڈلیاں بڑی مضبوط اور بڑی سڈول تھیں۔ میری اس حرکت پر بھی اُس نے مجھے نہیں روکا میری ہمت اور بڑھی۔ پھر وہ سیدھی ہو کر لیٹ گئی اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

عاکف یہ باتیں کر رہا تھا کہ چائے والا چائے لے آیا اور ہم نے کہا یار تو ہن ہی آنا سی ابھی تو ماحول بن رہا تھا۔ اُس نے کہا باؤ جی کیا بات تھی؟ ہم نے کہا! تو چائے رکھ اور جا۔ اتنے میں ایک گاہک آیا اُس نے کوئی کیسٹ پوچھی تو ہم نے جلدی سے کہا! یہ کیسٹ نہیں ہے ہمارے پاس۔ اسد بولا، میری دُکانداری کیوں خراب کرتے ہو مجھے کچھ پیسے بھی کمانے دو۔ ہم پانچ بندوں نے چار کپ چائے منگوائی تھی اور پیالیاں پانچ، پھر ہم چائے پینے لگ پڑے۔ زاہد نے کہا، ہاں عاکف پھر کیا ہوا؟ عاکف بولا مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا نہ میں کچھ سمجھتا تھا اُس وقت کہ یہ کیا کھیل ہوتا ہے لیکن وہ جو میری کزن تھی وہ کوئی کھلاڑی لگتی تھی اُس نے بڑے ماہر کھلاڑی کی طرح اپنا پورا بدن میرے حوالے کر دیا لیکن مجھے یہ سمجھ ہی نہیں تھی کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ بس میرے اندر ایک بے چینی تھی تجسس تھا میں نے ایک دم سے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کے ساتھ اُس کے بدن کے لمس کو محسوس کیا۔ نسرین ایک ماہر کھلاڑی کی طرح اپنا کام کر رہی تھی مگر میں خوفزدہ اور ڈرا ہوا تھا، وہ مجھے بار بار اپنی طرف گھسیٹتی تھی میں بڑا بیوقوف تھا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑتی لیکن مجھے الجھن محسوس ہوتی، وہ مجھے زور سے جپھی ڈالے ہوئی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی اور پھر کچھ لمحوں کے بعد وہ بالکل ریلیکس ہو گئی اور اُس نے مجھے سائیڈ پر کر دیا اور پھر ایسے سو گئی کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں پوری رات ڈرا رہا سہما

رہا خوفزدہ رہا کہ کہیں صبح اُٹھ کر یہ میری ماں سے شکایت نہ لگا دے۔

جب صبح ہوئی اور ہم سب لوگ ناشتہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے تو میری ماں نے نسرین سے پوچھا ،نسرین بیٹا رات کو نیند تو آ گئی تھی کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا بیٹا؟ تو اُس نے بڑے یقین سے کہا نہیں خالہ جی میں تو بڑے مزے میں سوئی ہوں ہاں عاکف نے نہ۔۔۔ یہاں آ کر وہ رُک گئی اور میرا رنگ زرد ہو گیا میرے ہاتھ میں چائے کا کپ کانپنے لگ پڑا کہ شاید وہ میری ماں کو میری شکایت لگانے لگی ہے پھر اُس نے میری طرف شرارتی آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ خالہ عاکف خراٹے بڑے مارتا ہے سونے نہیں دیا اس نے ساری رات۔ میری جان میں جان آئی اُس کے بعد پورا دن نسرین ہمارے گھر میں رہی مگر میں اُسے آنکھ ملا کر دیکھ نہ سکا مجھے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

جب رات کا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا تو میں سوچتا کہ یار یہ کیا ہو گیا، میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں میں نے کچھ کیا بھی نہیں اور میں خود کو چور محسوس کرتا تھا مگر نسرین تو بے پرواہ تھی وہ بار بار مجھے بہانے بہانے سے بلاتی، عاکف مجھے پانی دے دینا، عاکف میرے پاس آ کر بیٹھ میرے چھوٹا بھائی۔۔۔ میں اور زیادہ زمین میں گڑ جاتا مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ نسرین ایسے کیوں کر رہی ہے پھر شام کو جب وہ جانے لگی تو اُس نے جاتے ہوئے مجھے جھپی ڈالی اور میرے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی عاکف تو ہمارے گھر کب رہنے آئے گا چل آ میں تجھے ساتھ لے چلوں۔ میری ماں ایک دم بولی نہیں نسرین اس نے سکول جانا ہوتا ہے کسی دن ہم سب گھر والے اکٹھے آپ کے ہاں آئیں گے۔ امی اور ابو کو سلام دینا اور اُنھیں بھی کہنا کہ کبھی چکر لگا لیا کریں کافی عرصہ ہوا ہے اُنھوں نے ہمارے گھر کی طرف چکر نہیں لگایا۔ عاکف ابھی یہ بات کر رہا تھا کہ اتنے میں زاہد اُٹھا اور ایک دم سے بھاگنے کے انداز میں دکان سے باہر نکل گیا ہم سب نے آواز لگائی اوئے کہاں جا رہا ہے اُس نے وہیں سے جواب دیا غسل کرنے۔۔۔

گورکن

مجھے مرے ہوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میرے مرنے کی خبر امریکہ لندن قطر، ائیر لینڈ اور دبئ تک پہنچ چکی تھی، ابھی ہسپتال والوں نے میرا Death Certificate بھی میرے ورثاء کو نہیں دیا تھا مگر میں جو چند لمحے پہلے باپ، میاں، بھائی، ماموں اور چچا تھا مرنے کے بعد میری حیثیت مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی اب میں صرف میت تھا۔ جس کو 24 یا پھر شاید اس سے بھی پہلے چند گھنٹوں میں مٹی کے سپرد کرنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں، جو میرے قریبی رشتہ دار تھے اُن کو فون پر یوں بتایا جا رہا تھا کہ ننھا مر گیا ہے، میرے آفس کے دوست احباب کو یہ اطلاع دی گئی کہ نوید صاحب اب اس جہان میں نہیں رہے اور جو میرے ادبی حلقوں کے احباب تھے ان کو جب میرے مرنے کی خبر ملی تو میرے ایک ادبی دوست نے فیس بک پر یہ پوسٹ لگا دی کہ نوید گجراتی اب ہم میں نہیں رہے اُن کے جنازے کے وقت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا، پھر فیس بک پر ایک سلسلہ چل نکلا میرے افسوس کی پوسٹ کو کچھ لوگ لائیک کر رہے تھے کچھ حیرانگی کا اظہار کر رہے تھے کچھ ایک کلک کے ساتھ آنسوؤں والا نشان بنا کر اپنے دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔

ادھر میرے گھر والے میرے تدفین اور کفن کے انتظام کرنے میں لگے تھے میرے بہنوئی میری قبر بنوانے اور قبرستان میں کوئی صحیح جگہ کی فکر میں مصروف تھے اس سلسلے میں وہ اور میرا اکلوتا بیٹا قبرستان میں جا کر گورکن سے بات چیت کر رہے تھے۔ جو میرے عزیز ملک سے باہر تھے اُن کا اصرار تھا کہ جب تک ہم نہ آئیں جنازہ ادا نہ کیا جائے، میں خاموشی سے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا

مگر بے بس اور ساکت پڑا اپنے اگلے سفر کے بارے میں فکر مند تھا۔ میرا اکلوتا بیٹا ایک دفعہ پھر قبرستان میں میری قبر کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب کرنے گیا مگر گورکن نے بڑی بے رخی سے کہا کہ اس قبرستان میں اب کوئی جگہ باقی نہیں بچی کہ کوئی نئی قبر بنائی جاسکے اوپر سے کمیٹی والوں نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ میرے گھر والوں کا اصرار تھا کہ اسی قبرستان میں جگہ مل جائے تا کہ مجھے میرے والدین کے قدموں میں دفن کیا جاسکے مگر گورکن ایک ماہر دکاندار کی طرح یہ جان چکا تھا کہ یہاں قبر بنوانا ہماری مجبوری ہے۔ بڑی منت سماجت کے بعد اُس نے ہمیں بڑا احسان کر کے ساڑھے چھ فٹ بائے ساڑھے چار فٹ کی جگہ بنا دی میرے گھر والوں نے اس سے کہا کہ تم قبر تیار کرنا شروع کرو تو اُس نے کہا کہ کچھ ایڈوانس دے جائیں۔ اسی اثناء میں میری میت گھر لائی جا چکی تھی میری اس اچانک موت سے بے شمار میرے جاننے والے میرا مرنا ٹیلی فون پر کنفرم کر رہے تھے اور جنازے کا وقت پوچھ رہے تھے۔ میرے گھر والے جنازے کا وقت بتانے میں یہ کہہ کر فون بند کر رہے تھے کہ بعد میں آپ کو اطلاع دے دیں گے ابھی جنازے کا وقت طے نہیں ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک انسان کے مرنے سے کتنے لوگوں کا روزگار وابستہ ہوتا ہے ڈاکٹر، کیمسٹ، ہسپتال، ایمبولنس، پھولوں والا، پکوائی والا، ٹینٹ والا، بس، ویگن اور جہاز والوں اور مولوی صاحب، خادم اور پھر گورکن۔ گورکن کی تو روز کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ اللہ سے یہ دُعا بھی کرتا ہوگا یا اللہ میرے رزق میں اضافہ فرما۔ خیر گھر میں میت آنے کے بعد اور قبر کی تیاری تک کافی خواتین اور حضرات جمع ہو چکے تھے اور میری بیوی گم سم میری میت کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، کمرے میں موجود میری بہنیں بین کر رہی تھیں جب کوئی نیا مہمان آتا تو ایک بار کمرے میں بین اور رونے کی آوازیں ایک دم بڑھ جاتیں کچھ دیر کے بعد مدھم اور پھر بند ہو جاتیں۔

یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا مجھے غسل دینے کا وقت آیا تو میرے لئے گھر کے صحن میں پردہ لگا کر مسجد سے خادم صاحب پھٹا لے آئے مجھے اس پھٹے پر ڈال دیا گیا اور پھر مجھے غسل دیا گیا غسل دینے میں تین چار افراد اور شامل تھے جن میں میرا بیٹا اور بھانجا بھی شامل تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک وقت وہ ہوتا تھا جب میں اپنے واش روم میں اپنی مرضی کے شیمپو سے غسل کیا کرتا تھا مگر آج

مجھے لال صابن سے غسل دیا جا رہا تھا۔ غسل دینے کے بعد مجھے کفنایا گیا مسجد سے لائی ڈولی میں ڈال دیا گیا اور اُس پر پھول ڈال دیئے گئے پھر مجھے میرے گھر کے صحن میں آخری دیدار کے لئے رکھ دیا گیا تاکہ میرے اہل خانہ اور میرے رشتہ دار میرا آخری دیدار کر سکیں۔ ایک بار پھر میرے خاندان کی خواتین، میری بیوی اور میری بیٹیوں نے زور زور سے رونا اور بین کرنا شروع کر دیئے میرے سارے رشتہ دار جو بیرون ملک تھے، میرے چھوٹے سالے نے کھانے کے پیسے میرے ایک ہم زلف کو دیئے تاکہ مجھے دفنانے کے بعد جب لوگ واپس آئیں تو انھیں کھانا تقسیم کر دیا جائے۔ میری بیوی بڑی بہادری سے میرے بدائی کا منظر دیکھ رہی تھی میری چھوٹی بیٹی رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی مگر اب دُنیا میں میرا وقت پورا ہو چکا تھا۔ جنازے میں آئے کچھ لوگ مجھ سے ناخوش تھے اور کچھ خوش بھی تھے کچھ دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ چلو اس کے جانے سے خس کم جہاں پاک ہوا۔ میرا ایک دوست بالکل گم سم کسی سے بات نہیں کر رہا تھا شاید اُس کی آنکھوں میں ہماری دوستی کی ریل چل رہی تھی اُسے سب پتا تھا کہ میں نے کس کس کا قرض ادا کرنا ہے اور کس کس سے پیسے لینے ہیں خیر پیسے تو میں نے کم ہی لینے تھے زیادہ تر لوگوں کا قرض میں نے دینا تھا جو کہ زندگی میں وقتاً فوقتاً ضرورت کے تحت لیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ جلد لوٹا دوں گا مگر دُنیا داری کے گورکھ دھندے میں ایسا الجھا کہ وعدے کرتا رہا کہ اس دفعہ فلاں تاریخ کو فلاں مہینے تک آپ کا قرض چکا دوں گا مگر ہر دفعہ شرمندہ ہونا پڑتا کیونکہ کبھی بیوی کی بیماری پر پیسے خرچ ہو جاتے یا کبھی بیٹے کے سمسٹر کی فیس آڑے آجاتی یا پھر کبھی شادی شدہ بیٹی کے سسرال والوں کے ہاں کوئی غمی خوشی کی تقریب ہو جاتی جن میں مجھے خرچہ کرنا پڑتا اور یا پھر کبھی میں جان بوجھ کر پیسے ہوتے ہوئے بھی قرض نہ جھکا پاتا کیونکہ آپ سب جانتے ہیں کہ قرض اُٹھا لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ جب کوئی قرض کسی سے لیتا ہے تو بڑے سچے دل کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ بھائی صاحب انشاء اللہ اپنے وعدے پر پورا اُتروں گا آپ اس وقت مشکل آسان کر دیں مجھے جتنی ضرورت ہے اُتنا قرض دے دیں۔ جب دوست، رشتہ دار مجھے قرض دے دیتے پھر میں انھیں لوٹانے میں حیلے بہانے کرنے لگ پڑتا اسی طرح کئی مہینے کئی برس گزر گئے یہاں تک کہ میری موت کا وقت آ گیا جب کہ میں نے

سوچا بھی نہیں تھا کہ میں مر جاؤں گا۔

زندگی بھی کیا چیز ہے انسان جب تک زندہ رہتا ہے اُس کو آخری سانس تک یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ میں نے مرنا نہیں زندگی کے دوران وہ بے شمار دوستوں رشتے داروں کے جنازے بھی پڑھتا ہے قبرستان بھی جاتا ہے، انھیں مٹی میں جاتا ہوا دیکھتا بھی ہے اُن پر پتھر کی سلیں رکھی جارہی ہوتی ہیں اور یہ اپنے حصے کی مٹی اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر مرنے والے کی قبر پر ڈالتا بھی ہے مگر پھر بھی اُسے یقین ہوتا ہے کہ میں نے تو نہیں مرنا یہ ایسا دھوکہ اور فریب ہے جس میں کہ وہ آخری سانس تک مبتلا رہتا ہے۔

ابھی یہ سب کچھ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک چار بندے میرے گھر کے صحن میں داخل ہوئے اور انھوں نے خواتین کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور کہا آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں تاکہ ہم جنازہ اُٹھا سکیں اور پھر اُن لوگوں نے میری چارپائی کندھے پر اُٹھائی اور با آوازِ بلند خواتین کے رونے اور بین کرنے کے دوران آواز لگائی۔۔۔ کلمہ شہادت!

انسانیت

انسانی ثقافت ، جیسے ادب ، فلسفہ اور تاریخ کے بارے میں مطالعہ ہے اسی طرح ''انسانیت'' کا بھی مطالعہ ہے۔ یہ مطالعہ آپ کو عمومی معلومات فراہم کرتا ہے عملی تجارت نہیں۔ آپ شاید بیوٹی سکول میں انسانیت کا مطالعہ نہیں کر سکتے اس کے لئے آپ کو شکسپیئر ،افلاطون اور بیتھوون کا کام پڑھنا پڑے گا اور یہ سب پڑھنا انسانیت کے ایک حصے کی طرح ہے۔آپ سب جو مضامین پڑھ رہے ہیں ان میں تاریخ زبان انسانی ثقافت فائن آرٹس وغیرہ شامل ہیں انسانیت میں قدیم اور جدید زبانیں ادب،فلسفہ،جغرافیہ،قانون،سیاست اور مذہب شامل ہیں۔

انسانیت کے عالم،انسانیت کے علماء انسان دوست ہوتے ہیں۔میں آج اسی موضوع پر بات کرنے آیا ہوں آپ لوگ مجھ سے زیادہ باعلم ہیں، میں اور آپ اکٹھے بیٹھ کر انسانیت کے حوالے سے چند باتیں شیئر کریں گے اس میں سب سے پہلی بات سوالیہ انداز میں آپ سے کرنا چاہوں گا، وہ یہ ہے کہ کبھی آپ لوگوں نے اپنے اندر بیٹھ کر اکیلے میں سوچا کہ ہم انسانیت ،انسانیت کا ورد تو کرتے ہیں کیا ہم عملی طور پر بھی اس حوالے سے کام کر رہے ہیں اپنی اپنی استعداد میں؟ یہ ایک بہت غور طلب مسئلہ بھی ہے،سوچ بھی ہے خیال بھی ہے۔

آپ لوگ آپس میں دوست بھی ہیں، سٹوڈنٹ بھی، کلاس فیلو بھی ہیں کبھی آپ نے یہ محسوس نہیں کہ آپ کو اچانک کسی دوست کے کام سے یا کامیابی سے جلن ہو کہ یہ مجھ سے آگے نکل گیا ہے میں پیچھے رہ گیا ہوں۔کیوں نہ کسی طرح سے میں اسے روکوں کہ یہ بھی میرے طرح پیچھے آجائے

اور آگے کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ایسا خیال آخر کیوں آتا ہے انسانی دماغ میں؟ اس کے بارے میں آپ غور کریں اور سوچیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیشہ منفی سوچیں ہی کیوں اکثر انسانوں کے اندر جنم لیتی ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بدن اور روح کا جو رشتہ ہے اُس کو ہم کس طرح سے سمجھ سکتے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ اس کے بارے میں ہمیں غور کرنا چاہیے اور زندگی کی ظاہری اور باطنی حقیقتوں کو پانے کے لئے تگ و دو کرنی چاہیے اور ایسا کرنے کے لئے میرے خیال میں سب سے پہلے ہمیں جھوٹ اپنے اندر سے ختم کرنا پڑے گا۔ جبکہ میرا یہ یقین ہے کہ مجھ سمیت ہم سب لوگ آج کے دور میں جھوٹ بولتے ہیں اگر ہم اپنے جھوٹ ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اگر ختم نہ کر سکیں تو کم سے کم کر لیں تو شاید ہم ایک مثبت اور کامیاب زندگی گزار سکیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جھوٹ، منافقت، وعدہ خلافی، خیانت سے جان چھڑائیں

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا "جی ہاں"

پھر پوچھا گیا کہ کیا وہ بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "بخیل بھی ہو سکتا ہے"

پھر پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں مومن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"

یہ موتع اور مالک کی حدیث ہے

حسد، حسد بہت ہی خراب عادت اور نہایت ہی بُری بلا ہے یہ گناہ عظیم ہے حسد کرنے والے کی ساری زندگی جلن اور گھٹن کی آگ میں جلتی رہتی ہے اور اُسے چین اور سکون کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ کسی انسان کے دل میں ایمان اور حسد اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

جنوری کی بارشیں

سردیوں کی اندھیری رات تھی شدید بارش ہو رہی تھی اور بارش بھی وہ جو کہ پچھلے تین دن سے مسلسل ہو رہی تھی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی کبھی کبھی بیچ میں ہلکی ہو جاتی مگر پھر پندرہ بیس منٹ کے بعد اُس کی آواز میں اور برسنے میں شدت آ جاتی۔ گزشتہ تین دن سے پورے شہر کا نظام درہم برہم تھا نہ سرکاری ملازمین اپنی ڈیوٹی پر آرام سے جا سکتے تھے نہ پرائیویٹ کاروباری حضرات اپنے کاروبار کھول سکتے تھے۔ شہر کے نشیبی علاقوں میں پانی گھٹنوں گھٹنوں اور کہیں پر تو گردن تک پہنچ چکا تھا، نکاسی کا کوئی معقول نظام نہیں تھا جس کی وجہ سے غریب عوام اور چھوٹی آبادیوں کے لوگ اپنے روزمرہ کے معمولات معطل کر چکے تھے نہ گلیوں میں کوئی ریڑھی والا آ سکتا تھا۔ غریب گھرانوں میں جو کچھ آلو پیاز بچا ہوا تھا مائیں اپنے بچوں کو پکا پکا کر کھلا رہی تھیں مگر بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لیتی تھی، سب خوف کے عالم میں تھے غریب بستیوں میں بجلی کئی کئی گھنٹے سے غائب تھی گیس کا پریشر کم ہو چکا تھا۔

غریب کا چولہا تو ویسے ہی غربت کی وجہ سے ٹھنڈا ہوتا ہے مگر اِن تین دنوں میں بالکل ہی ٹھنڈا ٹھار ہو چکا تھا۔ نانیاں دادیاں کپڑے اور لکڑی کے ٹکڑوں سے مسافر بنا کر گھروں کے منڈیروں پر لگا رہی تھیں اُن کو یقین ہوتا تھا ایسا کرنے سے برستے بادل سمجھیں کہ یہ مسافر ہیں انھوں نے سفر کرنا ہے تو شاید بارش رک جائے اکثر ایسا کرنے سے بارش رُک بھی جایا کرتی تھی مگر اب جنوری کے

آخری دنوں کی تین راتوں میں اس بارش نے غریبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور وہ اللہ سے دُعائیں مانگ رہے تھے کہ یا اللہ اب تو بارش روک دے کیونکہ ہمارے گھروں میں برتن اور بالٹیاں بھی کم پڑ گئے ہیں چھتوں کے ٹپکنے سے جو گھروں میں پانی گر رہا ہے اُس کو سنبھالنے میں دشواری ہو رہی ہے بستر گیلے ہو رہے ہیں۔

شہر کی دوسری جانب جہاں پر ایلیٹ کلاس کے لوگ رہائش پذیر تھے وہ انجوائے کر رہے تھے اس بارش کو اپنی پکی اور مضبوط کوٹھیوں کے اندر سن رومز میں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کر رہے تھے ساتھ میں چائے کافی اور پکوڑوں کا دور چل رہا تھا قہقہے لگتے تھے، ایک سرشاری کا عالم اُن گھروں میں زندگی کی دوسری تصویر پیش کر رہا تھا اُن کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں تھیں بیل بجاتے تو ملازمین حاضر ہو جاتے کہ بی بی صاحبہ آپ نے بلایا اور بی بی صاحبہ حکم دیتیں منور جاؤ ڈرائیور کو کہو بچوں کے سکول سے آنے کا ٹائم ہو گیا ہے اُنھیں سکول سے لے آئے اور ہاں راستے میں اُن کے لئے کے ایف سی کے برگر بھی لیتا جائے اُنھوں نے صبح کا ناشتہ کے علاوہ کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اور منور کہتا جی بی بی صاحبہ میں ابھی افضل کو کہتا ہوں، بی بی صاحبہ پھر آواز دیتیں، منور افضل کو کہنا گاڑی بڑی لے کر جائے سڑکوں پر پانی زیادہ ہوگا گاڑی بند نہ ہو جائے۔ منور کہتا جی بی بی جی! اور منور ہاں خانسامے کو ذرا بھیج دو اُسے کہو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔

منور گیا تو خانسامہ آ گیا اور اُس نے کہا بیگم صاحبہ آپ نے مجھے بلایا؟ ہاں رشید میں نے تمھیں اس لئے بلایا ہے کہ صاحب نے فون کیا ہے کہ وہ گھر پر کھانا کھائیں گے چند دوست بھی اُن کے ساتھ آ رہے ہیں تو تم ایسے کر لینا کہ فنگر فش فرائی کر لینا ساتھ میں چکن کڑھائی بنا لینا اور پالک گوشت بھی پڑا ہے اُس کو بھی ذرا گرم کر لینا، بعد میں مہمانوں کو کھانے کے بعد قہوہ ضرور پیش کرنا۔ رشید بارش کتنی زبردست ہو رہی ہے پتے کتنے سرسبز و شاداب ہو گئے ہیں پودوں کی ساری مٹی دھل گئی ہے ایسے لگتا ہے جیسے انھوں نے نیا لباس پہن لیا ہے اور کتنے خوش ہو رہے ہیں ذرا ان پر نظر تو ڈالو۔ رشید جی بی بی صاحبہ کہہ کر باہر چلا گیا، وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بیگم صاحبہ کو کیا خبر کہ میرے گھر کی چھت ٹپک رہی ہے، کتنے دن سے بیگم صاحبہ کو کہہ رہا تھا کہ کچھ ایڈوانس پیسے دے

دیں میں اپنے گھر کی چھتوں کی مرمت کروالوں مگر بیگم صاحبہ ہمیشہ یہیں کہتیں کہ رشید تمھیں پتا ہے نہ کہ کاروبار کافی ڈاؤن جارہا ہے تمھارے صاحب کافی پریشان ہیں اچھے موڈ میں ہوں گے تو میں ضرور بات کروں گا۔ یہ "تبدیلی"، تو ہمیں لے کر ڈوب گئی ہے رشید دل ہی دل میں کڑھتا رہتا کیا یہ تبدیلی صرف امیروں کے لیئے ہی ہوئی ہے حالانکہ اس تبدیلی نے سب سے زیادہ عام آدمی کو متاثر کیا ہے اُس کی روزی روٹی پر اثر انداز ہوئی ہے اُس کی آمدن میں اضافہ تو نہیں ہوا بلکہ مہنگائی کی بارش میں ایک درمیانے طبقے کے عام ملازم اور مزدور سے اُس کی روٹی کا سالن بھی چھین لیا ہے۔ وہ جو پہلے کبھی سوکھی روٹی کے ساتھ کوئی سبزی دال کھا لیا کرتا تھا اب یہ اُس کی استطاعت سے باہر ہو گیا ہے یا وہ بھوکا رہے یا پھر بچوں کی تعلیم پر توجہ دے یا پھر اپنے بچوں کو یتیم خانوں میں جمع کروادے کم از کم انھیں دو وقت کی روٹی تو پیٹ بھر کر مل سکے گی مگر وہ ایسا کرنے سے بھی مجبور تھے۔

ایک دن منور اور رشید دونوں بیٹھے کچن میں اپنے اپنے گھروں کی کہانیاں ایک دوسرے کو سُنا رہے تھے، دل ہی دل میں اپنے مالکوں کی عمارت پر حسد کر رہے تھے، بے بسی کا عالم تھا رب سے شکایت بھی تھی مگر پھر آخر میں یہی کہتے تھے یار یہ بھی ٹائم گزر جائے گا جو بہترین بستر پر سوتا ہے اُس کی رات بھی گزر جاتی ہے اور جو بغیر گدے کے چارپائی پر سوتا ہے اُس کی رات بھی گزر جاتی ہے وقت کا بہاؤ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ وقت کے دریا میں بھنور بنتے رہتے ہیں سیلاب آتے رہتے ہیں دریا اپنے کناروں کا کٹاؤ کرتا رہتا ہے پرانی بستیاں سیلاب میں غرق ہو جاتی ہیں نئی بستیاں کچھ عرصے بعد آباد ہو جاتی ہیں یہ زندگی کا چل چلاؤ ہے کبھی دھوپ کبھی چھاؤں کبھی رات کبھی دن کبھی خوشی کبھی غم، کبھی گاڑی کبھی سائیکل، کبھی بیماری، کبھی شفا۔

رشید اور منور کو نہیں پتا تھا کہ یہ باتیں اُن کے ضمیر کی باتیں ہیں اور ضمیر اگر زندہ رہے تو کسی گھر، کسی محلے، کسی گلی کوئی بھوکا پیاسا نہ رہے، اور یہ جو ہمارے مالکان ہیں جن کے گھروں میں ہم نوکریاں کرتے ہیں اگر وہ ہمارے بچوں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیں اپنی عیش و آرام کی زندگی میں سے ایک گھرانہ اپنے ضمیر کی آواز سن کر ضرورت مند گھرانوں پر ایک فی صد بھی اپنی کمائی کا صرف کرنا

شروع کردے تو بہت سے سفید پوش لوگوں کا پردہ بنا رہے اُن کے بیٹے بیٹیوں کی تعلیم، شادی بیاہ اور روزمرہ کے مسائل آسانیوں میں بدل جائیں۔ مگر ایسا کون کرتا ہے ضمیر کی آواز کہہ رہی تھی کہ اکثر 95% امیر حضرات دل کے بڑے سخت ہوتے ہیں اُن کے اندر تکبر ہوتا ہے وہ اپنے سے کم تر کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے اُنھیں اچھوت سمجھتے ہیں اُن کے بنائے کھانے تو کھالیتے ہیں مگر اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پسند نہیں کرتے۔ اُن کے دھلے برتنوں میں تو کھالیتے ہیں مگر اُن کے استعمال کیئے ہوئے گلاس میں پانی پینا پسند نہیں کرتے۔ اگر یہ مٹھی بھر سرمایہ دار لوگ جن کے قبضے میں 95 فی صد غریب اور درمیانے درجے کے لوگوں کی روزی روٹی ہے اگر وہ اپنے اثاثوں میں سے ان 95 فی صد انسانوں کو تعلیم کی سہولیات دینا شروع کردیں اور بیماروں کو دوائیاں لے کر دینا شروع کردیں اور بھوکوں کو پیٹ بھر کے کھانا عزت کے ساتھ دینا شروع کردیں تو ہمارے معاشرے سے بہت ساری غیر اخلاقی روایات ختم ہوجائیں۔ ہمارے معاشرے سے جواء، شراب نوشی، چوری چکاری، چھوٹے موٹے جھگڑوں پر قتل وغارت گری ختم ہوجائے۔ خودکش حملے ختم ہوجائیں، اغواء برائے تاوان ختم ہوجائیں، گاڑیاں چوری ہونا ختم ہوجائیں، بچوں کے ساتھ جنسی زیادتیاں ختم ہوجائیں، لڑکیوں کی عصمت دری ختم ہوجائے کوئی غریب اور شریف خاندان کی لڑکی اپنی عزت نہ بیچے۔ یہ ساری باتیں منور اور رشید کے اندر جاری تھیں کہ اچانک بادل زور سے گرجا بجلی چمکی، اور منور نے سہم کر کہا یار آج پتا نہیں کس غریب کا گھر جل گیا ہو، کس کی چھت گر گئی ہو۔۔۔

قاصبی

آسمان پر آہستہ آہستہ ہلکے ہلکے بادل آ رہے تھے دھوپ چھاؤں کا کھیل جاری تھا کبھی کوئی بادل کا ٹکڑا ایک دم سے سورج کے آگے آجاتا تو موسم یک دم ٹھنڈا ہو جاتا مگر جب آسمان کی طرف نگاہ اٹھتی تو یہ احساس ہوتا کہ یہ بادل برسنے والے نہیں ہیں ابھی تھوڑی دیر میں چھٹ جائیں گے۔ پھر زوردار کڑکتی دھوپ زمین کے مکینوں پر اس سردی کے موسم میں سکون کی علامت بن کر اللہ کا بلا قیمت اور بغیر کوئی بل لئے تحفہ ہوگا۔ جب کبھی میں بادلوں کو غور سے دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے رب بادلوں کے ساتھ مختلف تصویریں بنا رہا ہے کبھی بادل کا کوئی ٹکڑا مجھے شیر کی طرح نظر آتا کبھی کسی بادل میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کہ کوئی بادل بادل نہیں بلکہ ہمارے گاؤں کا چرواہا فضلو ہے۔ کبھی انہی بادلوں میں اسی فضلو کی خوبصورت بیٹی اجو کا عکس نظر آتا یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا پھر اچانک کالے سیاہ بادل مشرق کی طرف سے جمع ہوئے اور پورے آسمان کو اپنی آغوش میں لے لیا ہلکی ہلکی بونده باندی شروع ہو چکی تھی بجلی کڑک رہی تھی بادل گرج رہے تھے ہم دوست ایک ڈھابے پر بیٹھے شکر کی چائے پی رہے تھے چینی کی چائے پندرہ روپے میں ملتی تھی اور شکر کی چائے بیس روپے میں ملتی تھی۔

ہمیں ڈھابے والے نے آواز دی، باؤ جی ڈھابے کے اندر آجائیں بھیگ جائیں گے۔ میں نے جاوید سے کہا چل یار اندر چلتے ہیں وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں دوست ڈھابے کے اندر چلے

گئے۔ڈھابہ کیا تھا بلیو ایریا کے ایک سرسبز شاداب گرین ایریئے کے کنارے لکڑیوں اور بھوس کا بنا ہوا ایک ڈھارا سا تھا جو کہ چولہوں کی وجہ سے سارا سیاہ ہو چکا تھا۔ڈھابے والوں نے بیٹھنے کے لئے لکڑی کے لمبے بینچ اور چند چار پائیاں بچھا رکھی تھیں وہاں پر اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے کچھ چائے پی رہے تھے کچھ کھانا کھا رہے تھے، ڈھابے کے اندر ہی تندور لگا ہوا تھا۔بلیو ایریا اسلام آباد کے گردونواح میں جو سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر تھے وہاں کے ملازمین یہاں آکر دوپہر کا کھانا کھایا کرتے اور چائے وغیرہ پیا کرتے تھے۔اس ڈھابے کی باقاعدہ طور پر کوئی منظوری یا اجازت سی ڈی اے سی نہیں لی گئی تھی مزے کی بات یہ ہے کہ جب اسلام آباد کا تعمیری نقشہ بنایا گیا تھا تو کسی بھی سیکٹر میں دو چیزوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی ایک مسجد اور دوسرے یہ غیر قانونی ڈھابے مگر اسلام آباد میں ہر سیکٹر میں یہ دونوں چیزیں آج کے دور میں موجود ہیں اور کئی برسوں سے ہیں۔ مختلف مکاتبِ فکر کے مولویوں نے ہر سیکٹر کی گرین بیلٹ پر اپنی اپنی مساجد قائم کر رکھی تھیں بناء کوئی پلاٹ کی قیمت ادا کئے اور بغیر سی ڈی اے کی اجازت کے۔یہی حال ڈھابے والوں کا تھا کبھی کبھی شہری انتظامیہ کو غصہ آتا تو وہ ڈھابے والوں پر دھاوا بول دیتی اور آپریشن کلین اپ کے نام پر توڑ پھوڑ کرتی مگر کبھی جرأت نہ ہوئی کہ مولویوں اور مساجد پر بھی ایسی قانونی ضرب لگائے۔

آپ تو جانتے ہیں پانی ہمیشہ ڈھلواں کی طرف بہتا ہے اتنے میں ہماری شکر کی چائے آگئی، جاوید نے کہا یار کوئی بسکٹ لے گا؟ میں نے کہا یار رہنے دے چھوڑ۔جاوید بولا، نہیں یار منگوا لیتے ہیں پیسے میں دوں گا۔میں ہنس پڑا اور کہا، نہیں یار پیسے میں دے دوں گا کیسی باتیں کرتا ہے۔پھر اُس نے ڈھابے کے ملازم کو آواز دی جو کہ 16 یا 17 برس کا گورا چٹا لڑکا تھا دیکھنے میں کشمیری لگتا تھا پھٹے بوٹ پہنے ہوئے تھے ڈھابے کی نکڑ پر ایک بالٹی پانی سے بھری پڑی تھی جو لوگ چائے پی کر چلے جاتے تھے نائیک آواز دیتا، بالے او یہ برتن اُٹھا اور ان کو دھو دے۔لڑکا وہ برتن اُٹھاتا اور پانی والی اُس بالٹی میں ڈال دیتا پھر ایک اور بالٹی میں ڈبکی لگوا کر اُن برتنوں کو دوبارہ استعمال کے لئے اپنے نائیک کے سامنے رکھ دیتا اور پھر جب کوئی نیا گاہک آتا تو چائے اور کھانا ڈال کر گاہکوں کو اُنہی برتنوں میں دے دیا جاتا۔

کبھی کبھی بالا اپنی جیب سے نسوار کی پڑی نکالتا اور اپنی دائیں گال میں گولی بنا کر دبا لیتا پھر ہاتھ کو قمیص کے ساتھ صاف کر کے اپنے کام میں لگ جاتا، کسی کو فرائی کی ہوئی دال دیتا جو کہ کڑاہی میں فرائی کی جاتی تھی اور کسی کو آلو ٹینڈے کی سبزی دیتا۔ کبھی کبھی یہاں پکوڑوں والی کڑی بھی بنا کرتی ہفتے میں شاید ایک بار مگر اُس کا سواد بڑا آتا تھا۔ ڈھابے پر کوئی صفائی ستھرائی کا خاص خیال نہیں تھا مگر پھر بھی یہاں اچھی خاصی بھیڑ رہا کرتی تھی اور یہ بھیڑ شام پانچ چھ بجے تک قائم رہتی، ساتھ ہی گندہ نالہ بہتا تھا۔

اتنے میں، میں نے ٹائم دیکھا تو جاوید کو کہا چل یار کافی ٹائم ہو گیا ہے واپس دفتر چلتے ہیں جب ہم اُٹھے نائیک کے پاس پیسے دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو بالے نے آواز لگائی دو چائے شکر والی ایک پیکٹ بسکٹ کا 55 روپے اُستاد جی۔ جاوید نے ساٹھ روپے دیئے ہم لوگ باہر نکلنے لگے تو بارش تھوڑی آہستہ ہو چکی تھی مگر رکی نہیں تھی۔ جاوید نے میرا ہاتھ پکڑا اور سہارا دے کر گہرائی سے اوپر سڑک تک لے آیا پھر ہم آہستہ آہستہ دفتر کی طرف چل پڑے۔

شام کو جب میں گھر آیا ٹھنڈ کافی ہو چکی تھی میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے۔ ماں نے پوچھا "پتر آ گیا ہے"، میں نے کہا جی ماں جی آ گیا ہوں۔ ماں نے کہا بیٹا کھانا کھانا ہے؟ میں نے کہا نہیں ماں جی چائے کا ایک کپ گرما گرم دے دیں کیونکہ ٹھنڈ بڑی لگ رہی ہے۔ ہمارا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا جس میں ایک چھوٹا سا برآمدہ بھی تھا، ایک باورچی خانہ اور ایک واش روم۔ ہمیں جب بھی باورچی خانہ یا واش روم استعمال کرنا ہوتا تو چھوٹے سے صحن میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا اور اگر کوئی مہمان آ جاتا کبھی تو ہمیں اُس کو سُلانے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ میری چار بہنیں، والدین اور میں ہم سات افراد اِن دو کمروں میں ہی رہا کرتے تھے۔ میری ایک بڑی بہن جس کی شادی کی عمر گزر چکی تھی وہ گھر میں لوگوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ ماں اُس سے جھگڑتی رہتی کہ شازیہ اتنے رشتے آتے ہیں تو ہاں کیوں نہیں کرتی؟ تو وہ جل کر کہتی اماں جب میری شادی کی عمر تھی تب لوگوں نے نہیں قبولہ تو اب کون مجھ سے شادی کرے گا اور میں نے اب شادی وادی نہیں کروانی تو نازیہ کی شادی کے بارے میں سوچ اس کے لئے کوئی رشتہ تلاش کر اب

اس کی عمر ہے شادی کی اور ہاں پیچھے دو بہنیں ابھی اور بھی کھڑی ہیں اقراء اور اسراء۔ ماں کہتی پتر نصیبوں کی بات ہے جب اللہ کا حکم ہو گا تو پتا بھی نہیں چلے گا تم سب اپنے اپنے گھروں میں چلی جاؤ گی۔

میں ماں بیٹی کی یہ گفتگو سن کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا اور رب سے گلہ کرتا، اللہ پاک ہمارے دن کب پھریں گے ہم لوگ تو اپنا گاؤں چھوڑ کر آئے تھے کہ ابا کہتا تھا کہ پتر شہر میں بڑی آسانیاں ہوتی ہیں گاؤں والے ہمیں پسند نہیں کرتے کیونکہ میرا ابا گاؤں میں حجام کا کام کرتا تھا اور لوگ گاؤں میں جتنے بھی محنت کش کرنے والے لوگ ہیں جن میں درزی، موچی، رکشہ چلانے والے، ترکھان، مستری ان سب کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور پکارا جاتا تھا چونکہ گاؤں کی زندگی میں ہم لوگوں کے نام ہمارے پیشے کے ساتھ پکارے جاتے ہیں جب بھی کبھی کسی وڈیرے چوہدری یا امیر آدمی کو ہم میں سے کسی بھی قسم کا کام کروانے کی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے بچوں کو آواز دیتا، جا پتر او شفعی لوہار کو بلا لا، یا جا یار ندیم موچی سے میرے جوتے پالش کروا لا اور ہاں آتے ہوئے، نواز نائی کو کہنا کہ ابا نے بال کٹوانے ہیں کسی اور کو ٹائم نہ دے وہ دس منٹ میں آرہے ہیں۔

ایسی تمام سوچیں میرے اندر بچپن ہی سے موجود تھیں اور مجھے لوگوں کے ایسے رویوں نے بہت دکھی کر رکھا تھا اور میں شدید گھٹن کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسی چکر میں میرے ابا نے گاؤں سے ہجرت کی اور ہم شہر آ گئے مگر شہر آ کر بھی میرے ابا کے پیشے نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا، جس کی وجہ سے میری بہنوں کی شادیاں نہ ہو سکیں، گو کہ ہمیں شہر میں آئے ہوئے 22 سال گزر چکے تھے مگر ابھی تک ہم مجیدے نائی کے بچے تھے، اور نا جانے کب تک یہ مجید نائی کے نام کی باز گشت کتنے نسلوں تک چلے گی۔

کٹی پتنگ

انسان کا دماغ بھی کیا چیز ہے کبھی آپ نے غور کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو آج اس تحریر کو پڑھنے کے بعد ضرور غور کیجئے گا، میں اِس وقت 55 کا ہو چکا ہوں اور یقین مانئے میرا ذہن مجھے اپنے بچپن میں لے گیا ہے پوری فلم میری آنکھوں کے سامنے چل پڑی ہے۔ 1972ء کا سن ہے اتوار کا دن ماں میری نے میرے اور میرے ابا کے کپڑے استری کر کے رکھے ہوئے ہیں محلے میں راجہ لہراسب کی بیٹی کی بارات آنی ہے میں نے اور ابا نے وہاں جانا ہے دوپہر کا کھانا کھانا ہے ہمارا شادی میں جانے کا اور کیا مقصد ہے بس محلے داری نبھانا وہ بھی اس لئے کہ راجہ صاحب نے میری بہن کو آرمی نرسنگ سکول میں داخل کروایا تھا اور اُن کی سفارش کی وجہ سے میری بہن آرمی نرسنگ سکول میں داخل ہوگئی تھی تین سال کے لئے۔

میں گلی میں تھا کسی کام سے گیا ہوا تھا اندر صحن میں آیا۔ پہلے پرانے گھروں میں دروازے کے بعد ڈیوڑی اور پھر کھلا صحن ہوتا تھا صحن کے بعد بڑا کمرہ، پیچھے ایک چھوٹا کمرہ، صحن کے ایک طرف باورچی خانہ اور صحن کے بالکل سامنے غسل خانہ تھا۔ جب میں صحن میں داخل ہوا تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے چھت پر جو مُٹی ہے اُس پر دو پتنگوں کا پیچ پڑا ہوا ہے اور ڈور ہماری مُٹی پر پڑ رہی ہے میں نے چپکے سے اپنے پاؤں کی سینڈل اُتاری یہ وہ سینڈل تھی جو ماں نے مجھے کالج روڈ پر باٹا کی ایک دُکان سے 11 روپے میں لے کر دی تھی جہاں پر سیل چل رہی تھی۔ میں چپکے سے سیڑھیاں چڑھا، سیڑھیاں ڈیوڑی میں تھیں میری عادت تھی جب بھی سیڑھیاں چڑھتا یا اُترتا تو سیڑھیاں گنتا تھا مجھے آج تک یاد ہے میرے اُس گھر کی سیڑھیاں 15 تھیں میں وہ 15 سیڑھیاں چڑھ کر چپکے سے اُوپر

چلا گیا آگے جا کر میں چھت کی منڈیر پر چڑھا اور ممٹی پر چڑھنے کی کوشش میں، میں نے جب ممٹی کی دیوار پر ہاتھ ڈالا تو ممٹی کی دیوار کی اینٹیں اپنی جگہ سے کھسک گئیں اور میں دھڑام سے اپنے ہمسائیوں کی چھت پر جا گرا جب میں گرا تو ممٹی کی تین چار اینٹیں بھی میرے اوپر آ کر گر پڑیں اُن کے گرنے سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ دو پتنگیں اُسی جگہ پیچ لڑاتی رہیں۔ دھڑام کی آواز سُن کر میرے ابا اور ماں چھت پر بھاگے آئے جب اُنھوں نے دیکھا کہ میں اپنے ہمسائیوں کی چھت پر گرا پڑا ہوں اور رو رہا ہوں اینٹیں مجھ پر گری ہوئی ہیں اور میں اُٹھ نہیں سکتا وہ بے بسی کی صورت مجھے آج بھی نظر آ رہی ہے۔ میرے ابا نے جو کہ اُس وقت پینٹ پہنے ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے شادی پر جانا تھا انھوں نے منڈیر پر بیٹھ کر ہمارے ہمسائے کی مدد سے میرے دو بازوؤں کو پکڑا اور مجھے اُوپر اپنی طرف کھینچا اور ساتھ میں مجھے بڑی بڑی گالیاں دیتے رہے۔ میں بے بسی سے وہ گالیاں سنتا رہا مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میرا باپ مجھ سے ہمدردی کے دو بول کیوں نہیں بول رہا مجھے گالیاں کیوں دے رہا ہے مجھے تسلی کیوں نہیں دے رہا؟ میری ماں حواس باختہ یہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی، مجھے اسی حالت میں گود میں اُٹھا کر نیچے بڑے کمرے میں لایا گیا، میری ٹانگ پنڈلی سے اوپر جسے انگریزی میں تھائی بون کہتے ہیں وہاں سے ٹوٹ چکی تھی میری ٹانگ میں بہت زیادہ سوزش بڑھتی جا رہی تھی شدید درد بھی ہو رہا تھا میں تکلیف میں تھا گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ میں ایک بیمار مرغ کی طرح صرف گردن اور آنکھیں ہلا سکتا تھا میری ماں دوڑی دوڑی باورچی خانے میں گئی اور میرے لئے دودھ لے کر آئی کہ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے ہیں اِسے دودھ دو مجھے چند چمچ دودھ کے پلائے گئے۔

افراتفری کے عالم میں محلے والوں کو بھی پتا چل گیا کہ قاسم کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے وہ چھت سے گرا ہے پتنگ پکڑنے کے چکر میں۔ اتنے میں میری بہن کی ایک دوست مصباح گلی میں سے گزر رہی تھی اُس کو جب پتا چلا تو وہ ہمارے گھر اندر کمرے میں آ گئی اُس نے مجھے گود میں اُٹھا لیا مگر میرا باپ مجھے بدستور گالیاں دے رہا تھا اور انتہائی غصے میں تھا۔ ہمارا گھر گلی کے درمیان میں واقع تھا اور گلی بھی تنگ تھی جس میں سے بمشکل دو موٹر سائیکل گزر سکتے تھے، گلی کی ایک لائن میں تیس سے

پنتیس گھر تھے اور اِسی طرح سامنے والی لائن میں بھی اتنے ہی گھر تھے۔ مجھے گود میں اُٹھایا گیا اور گلی کی نکڑ تک لے جایا گیا وہاں پر کھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار کیا گیا۔ اللہ کا شکر کہ ٹیکسی جلدی مل گئی اور مجھے ٹیکسی میں بیٹھا کر محلّہ امام بارہ گلی نمبر 10 مکان نمبر BB-538 سے اُٹھا کر سینٹرل گورنمنٹ ہسپتال راولپنڈی منتقل کیا گیا اُس دن چھٹی کا دن تھا اتوار، مجھے Casuality میں لے جایا گیا وہاں پر موجود ڈاکٹروں نے مجھے سٹریچر پر ڈالا مگر میری ٹانگ پھول کر کُپا ہو چکی تھی ڈاکٹروں نے ایمرجنسی میں ایکسرے کروایا اور ایکسرے کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگے۔ میری ٹانگ سے شلوار اُتار دی گئی تھی اپریل کے دن تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے دوپہر کی دھوپ تھی مگر مجھے ایمرجنسی میں ٹھنڈ لگ رہی تھی اتنے میں ایکسرے رپورٹ آگئی۔ انھوں نے کہا ہڈی کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں اس کو ویٹ باندھا جائے اُس وقت ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں نے میری ٹانگ کو سیدھا کرنے کے لئے کھینچا مجھے بہت تکلیف ہوئی میری چیخیں نکل گئیں پھر اُنھوں نے ایک شکنجا سا میری ٹانگ میں ڈال دیا اور اُس کے نیچے ویٹ باندھ دیا یہ سب کچھ اُنھوں نے سٹریچر پر کیا اور پھر مجھے گیارہ نمبر ہڈی وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ سپیشلسٹ ڈاکٹر کو اطلاع دی گئی کہ سر ایک مریض آیا ہے اُسے آپ نے آ کر دیکھنا ہے اُس دور میں ہڈی سپیشلسٹ ڈاکٹر نہیں تھے عام سرجن Arthopedic کا کام کیا کرتے تھے اُس دن تو کوئی ڈاکٹر نہیں آیا مگر اگلے دن ایک بہت ہی متین اور میٹھے لہجے میں بولنے والے ڈاکٹر صاحب میرے پاس وارڈ میں آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے بیٹا یہ کیسے ہوا، کیا کر لیا تم نے؟ میرے ابا پاس ہی کھڑے تھے اُنھوں نے کہا یہ اُلو کا پٹھا ہے اچھا بھلا گھر میں تھا ہم نے شادی پر جانا تھا پتا نہیں اس کو کیا سوجھی پتنگ کی ڈور دیکھی اور اُوپر بھاگ گیا اور آج ہم آپ کے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، بیٹا فکر نہیں کرو سب ٹھیک ہو جائے گا پھر اُنھوں نے میرے پاؤں کی طرف دیکھا اور کہا ویٹ ذرا بڑھا دیں تاکہ اِن کے ٹانگ کی ہڈی جلد سیدھی ہو سکے جب یہ بالکل سیدھی ہو جائے گی پھر ہم اس کو پلستر کر دیں گے۔ وہ یہ کہہ کر دوسرے مریض کی طرف چلے گئے اور میں اپنی بے بسی پر نادم ہوتا رہا کہ یہ کام کیوں ہو گیا میں نے تو ڈور پکڑنی تھی میں نے تو پتنگ پکڑنی تھی میں کہاں پھنس گیا آخر ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ؟

میرا بڑا بھائی اُس وقت میرے ساتھ تھا، ابا نے کہا اب میں گھر جارہا ہوں تم اس کے پاس رُکو، میرا بھائی بھی پڑھائی میں نالائق تھا اُسے بھی ڈانٹ بہت پڑتی تھی اوپر سے میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ میں ابھی تیسری کلاس میں پڑھتا تھا، میری چار بہنیں تھیں، باپ سرکاری ملازم تھا کسی محکمے میں کلرک تھا، اُس کی اتنی آمدن نہیں تھی کہ ہم چھ بچوں اور ماں باپ کا اکیلا بوجھ اُٹھا سکے مگر وہ اُٹھا رہا تھا، اوپر سے اچانک میری بیماری آن پڑی۔ آپ یقین مانئے کہ میں ایک ہفتہ ہسپتال میں رہا پھر مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے اُنھوں نے اپنے منہ پر ماسک چڑھایا ہوا تھا سر پر ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ آپریشن تھیٹر کا ماحول بڑا خوفزدہ سا تھا ایک بہت بڑا گول سا لائٹوں کا گلوپ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اب بھی ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے اور اُنھوں نے کہا گھبراؤ نہیں بیٹا سب ٹھیک ہو جائے گا، ایک ٹیکہ تمھیں لگائیں گے، انھوں نے میرے بازو کی نس میں ٹیکہ لگایا اور مجھے گنتی گننے کے لئے کہا۔ میں نے اپنے ذہن کو بڑا پکا کیا کہ بڑی لمبی گنتی گنوں گا اور میں نے گننا شروع کیا، ایک دو تین اور پھر اُس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اس بات کو آج 47 برس ہو گئے ہیں مگر یہ بات اُسی طرح میرے ذہن میں زندہ ہے اور کبھی کبھی یہ سین میرے ذہن میں ریپیٹ ہوتا رہتا ہے اور میں کسی کٹی پتنگ کی طرح خود کو کسی درخت پر لٹکا ہوا محسوس کرتا ہوں جس کو پکڑنے کے لئے بچے کانٹیاں ڈالتے ہیں یا پتھر مارتے ہیں۔ اب آپ بھی اپنے ذہن پر جہاں بیٹھے ہیں جس جگہ پر بیٹھے ہیں، جو جو یہ میرے الفاظ پڑھ رہا ہے وہ سوچے ذرا! کہ رب نے دماغ کیسا بنایا ہے ایک لمحے میں آپ ماضی میں چلے جاتے ہو اور اپنے ماضی کی کوئی بھی یادداشت آپ کے سامنے آجاتی ہے بالکل ایسے جیسے کسی فلم کسی ڈرامے کا کوئی سین ہو، وہ سین جو کسی نے دیکھا نہ ہو، یہ صرف آپ کو نظر آتا ہے آپ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور ذرا جھانکیں کہ آپ نے کبھی کوئی ایسی حرکت کی کہ جس پر آپ کو عمر بھر پچھتانا پڑے۔۔۔۔۔

خزاں

گرمیوں کا موسم جب اپنے اختتام کی طرف سفر پذیر ہوتا ہے تو پہلے ساون آتا ہے، ساون میں شدید بارشیں ہوتی ہیں، گہرے بادل چھاتے ہیں، شدید آسمانی بجلی کڑکتی ہے، کبھی دن میں گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے، گھروں میں روشنیاں جل پڑتی ہیں، سڑکوں پر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن ہو جاتی ہیں، غریب عوام بارش سے بچنے کے لئے پناہ ڈھونڈتے ہیں، معاشرے کی ایلیٹ کلاس ساون کا موسم انجوائے کرتی ہے، اپنی فیملی کو گاڑیوں میں بٹھا کر اسلام آباد کی سڑکوں پر نکل پڑتی ہے۔

پھر بھادوں کا مہینہ آجاتا ہے، اِس مہینے کا بھی اپنا رنگ، اپنا مزاج ہے، ہم جس زمانے میں جی رہے ہیں اس میں جہاں تک میرا ناقص علم ہے 3 کیلنڈر چل رہے ہیں، ایک بکرمی کیلنڈر، ایک عیسوی کیلنڈر اور تیسرا ہمارا اسلامی کیلنڈر۔ ان تینوں کیلنڈروں میں بارہ ماہ ہوتے ہیں چونکہ یہ کیلنڈرز چار موسموں پر تقسیم ہوتے ہیں، گرمی، سردی، خزاں، بہار اور آج کا ہمارا موضوع یا موسم خزاں کا موسم ہے، اور خزاں کا موسم ساون، بھادوں جون جولائی گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے خاص طور پر عیسوی اور بکرمی کیلنڈر کے مطابق اکتوبر کا آخر اور (پوماہ کا شروعات) جب درختوں سے پتے زرد ہو کر زمین پر گرنے لگ پڑتے ہیں، اور تمام کیاریاں، باغات اور جنگلات بے لباس ہو جاتے ہیں، دن چھوٹے، راتیں لمبی ہو جاتی ہیں۔

یہ موسم اہل عشق کے لئے، ہجر و فراق کا موسم ثابت ہوتا ہے جس میں روح بے چین بدن بے جان

ہو جاتا ہے، کچھ دیر کے لئے ایسے لگتا ہے کہ یہ اشجار کی برہنگی ہمیشہ اسی طرح رہے گی، دل کا صحن سُونا ہو جاتا ہے۔ جب تک خزاں کا موسم رہتا ہے بے چینی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، ظاہر اور باطن دونوں بے پردہ ہو جاتے ہیں، انسانی رویئے سست پڑ جاتے ہیں، رشتوں میں سرد مہری آجاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ اپنے بچھڑ گئے، کوئی کسی کا نہیں۔ جو گرم جوشی گرمیوں کے موسم میں ہوتی ہے وہ خزاں کے موسم میں ماند پڑ جاتی ہے، مگر پھر بھی حضرتِ انسان اِن تین کیلنڈروں کی غلامی میں اپنی زندگی تقسیم کر کے بسر کرتا رہتا ہے، نا جانے اِس میں رب کی کیا حکمت ہے کہ وہ بچھڑنے اور ملنے کی آنکھ مچولی ازل سے کھیل رہا ہے اور شاید ابد تک کھیلتا رہے گا۔ انسان قدرت کے ہاتھوں کھلونا بنا رہے گا اور کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی تقدیر کے دھاگے اشاروں پر چلاتا رہے گا۔

میں جب اپنے اندر کا موسم دیکھتا ہوں تو اُس موسم کے اندر اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، بڑا بے چین ہو جاتا ہوں کیونکہ خزاں کا موسم میرے اندر ازلی طور پر آسیب کی مانند چھا چکا ہے اور میں انتہائی کوشش کے باوجود اِس آسیب زدہ خزاں کے موسم کو اپنے اندر سے نہیں نکال سکا میں نے بہت سے بابوں سے دُعا کرائی، منتیں مانگیں، التجائیں کیں، رویا، گڑگڑایا ساون کی بارش کی طرح، بھادوں کے بادل کی طرح۔ مگر میں آج تک خزاں رسیدہ درخت کی مانند بے ثمر ہی رہا میرے اندر کبھی بہار کی کونپلیں نہ پھوٹ سکیں۔

کبھی آپ نے اپنے اندر کا موسم محسوس کیا ہے، یہ اُن چار موسموں کے علاوہ ہے، میں اِسے پانچواں موسم کہتا ہوں جو اِنسانی وجود کے اندر جنم لیتا ہے اور جو اِن چار موسموں سے مل کر بنتا ہے، اِس میں رشتوں کی گرمی، سردی، رویوں کی تلخی اور خیر و شر کا ملا جلا رُجحان پایا جاتا ہے۔ میری آپ سب سے جو جو بھی اِس تحریر کو پڑھ رہا ہے، سے درخواست ہے کہ اپنے اندر ضرور جھانکیں، دیکھیں کہ آپ کے اندر کون سا موسم چل رہا ہے؟ میرے اندر تو مسلسل موسم خزاں ہے اور مجھے اُس سے عشق ہے، اور عشق بھی ایسا جو مرتے دم تک میرے ساتھ رہے گا۔

آیئے چلیں اپنے اپنے اندر سیر کریں، اپنی روح کے موسم کا پتا کریں اور مزہ بھی لیں، شاید میں کچھ زیادہ جذباتی ہو گیا ہوں کیونکہ دسمبر چل رہا ہے۔ اور دسمبر وہ مہینہ ہے جس میں ہر طرف اُداسی

مایوسی اور یاسیت ہوتی ہے مگر دسمبر کے آخر میں جنوری کی آمد کی نوید بھی موجود ہے۔آیئے اپنے اپنے موسموں کو سمیٹیں، اس سے پہلے کہ 16 دسمبر کا موسم ہمارے جسموں میں دوڑتے ہوئے خون کو منجمد کر دے، بات موسم خزاں سے چلی تھی، اور موسمِ خزاں پر ہی ختم ہونے جا رہی ہے۔۔۔

سرد لمحوں کے پل
زرد پتوں کے رنگ
بے ثمر درختوں کے سنگ
میرے آنگن میں پھیلے
میرے قدموں تلے
بکھرے ہوئے خشک پتوں کی
سرسراہٹ جان لیوا
حقیقت میں بدل جائے نہ
الوداع الوداع الوداع
اے موسمِ خزاں الوداع۔۔۔۔

خوف

سب سے خطرناک نشہ خوف ہے 2020ء میں خوف کو بڑا مارکیٹ کیا گیا، اس کی بڑی تشہیر کی گئی، ہر جگہ خوف ہے موت کا خوف ہے، غربت کا خوف ہے۔ مثلاً انسان کو بے شمار خوفوں میں مبتلا کر دیا گیا اور اِس خوف کے حوالے سے پوری دُنیا کو آگاہ کیا گیا۔ میری رائے میں انسان جب پیدا ہوتا ہے تو خوف لے کر پیدا ہوتا ہے، خوف اُس کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور اُس کی موت تک چلتا ہے۔ اِس پیدا ہونے اور مرنے کے درمیان میں جتنے بھی خوف ہیں، وہ مسلسل اُن سے گزرتا ہے، اُن کا مقابلہ کرتا ہے، لڑتا ہے، جھگڑتا ہے۔ مثال کے طور پر پیدا ہونے کے بعد اُسے سب سے پہلا خوف جسکا شعوری طور پر شاید اسے احساس بھی نہیں ہوتا وہ بھوک کا خوف ہوتا ہے، بھوک کا خوف مِٹانے کے لئے ماں اُسے اپنا دودھ پلاتی ہے۔ یہ ماں کی ممتا کا خوف ہوتا ہے کہ میرا بچہ بھوک سے پریشان نہ ہو اور اگر ماں کی استطاعت نہیں ہوتی دودھ پلانے کی تو پھر وہ ڈبے، بکری، بھینس یا گائے کے دودھ پر آجاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ انسان بڑا ہوتا ہے، اُسے چلنے کا خوف شروع ہو جاتا ہے، وہ کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے، چلنے سے ڈرتا ہے، کہیں گر نہ جاؤں، کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔ آج سے پچاس برس قبل ماں باپ ایک لکڑی کا ریڑہ ترخان سے بنوالیا کرتے تھے وہ اپنے بچے کو کھڑا کر کے اُس ریڑے پر ہاتھ رکھ کر اُسے چلنا سکھاتے تھے تاکہ اُس کو چلنا آجائے اور وہ گرنے کے خوف سے بچ جائے۔ موجودہ دور میں لوگ اپنے بچوں کے لئے واکر لے آتے ہیں اور اپنے بچوں کو گرنے کے خوف سے نجات دلواتے ہیں۔ پھر بچہ جب

سکول جانا شروع کرتا ہے تو اُس کو پڑھنے کا خوف لاحق ہو جاتا ہے، کبھی لکھنے کا خوف اور اِسی خوف میں وہ اپنی زندگی گزارتا ہے، کبھی فیل ہوتا ہے، کبھی پاس، یہ فیل ہونا بھی ایک خوف ہے اور یہ خوف مسلسل انسان کا پیچھا کرتا ہے۔

جھوٹ بولنے کا خوف، اپنے ماں باپ سے اپنے بہن بھائیوں سے اپنے رشتے داروں سے اپنے دوستوں سے اپنے اساتذہ سے، ہوم ورک نہ کرنے کا خوف، ہوم ورک کر کے اُس میں غلطیاں پکڑے جانے کا خوف، سالانہ امتحانات میں داخلہ نہ جانے کا خوف، سکول کالج میں حاضری پوری نہ ہونے کا خوف، گھر آ کر نتیجہ بتانے پر والدین سے ڈانٹ کھانے اور بے عزت ہونے کا خوف، ملازمت مل جائے تو اپنے سینئیر ز کا خوف، دوران نوکری کام کرتے ہوئے کوئی نادانستہ غلطی ہو جانے کا خوف، اُس پر گرفت کا خوف، سالانہ Annual Confidential Report خراب ہو جانے کا خوف، اپنے سے زیادہ پڑھے لکھے جونیئر کا خوف اُس کے سامنے اپنے سینئر ہونے اور اپنے آپ کو اُس سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کا خوف، پرموشن ہونے یا نہ ہونے کا خوف، بغیر اطلاع چھٹیاں کر کے دفتر جا کر اپنے سینئرز سے ڈرنے کا خوف، شادی کے بعد کا خوف کہ والدین میری بیوی کو کس طرح تسلیم کریں گے؟ اور میں اپنی بیوی کی نظروں میں خاوند کی حیثیت سے کس طرح زندگی گزاروں گا، اور کیا میری بیوی وہ مجھے عزت دے گی جس کا کہ میں مستحق ہوں؟ سسرال کا خوف کہ مجھے اچھا سمجھیں بُرا نہیں، میرے بارے میں اپنی بیٹی کے حوالے سے مطمئن رہیں۔ شادی کے بعد دوستوں سے کم ملنے دوستیاں ختم ہو جانے کا خوف۔ دُنیا داری میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا خوف، کسی کی امارت دیکھ کر اپنی غربت کا خوف، کسی کی غربت دیکھ کر اپنی امارت کھو جانے کا خوف۔

خوف ہر لمحہ ہر جگہ مسلسل اِنسان کا پیچھا کرتا ہے، جب تک انسان کے بدن میں خون دوڑ رہا ہے، دل کی دھڑکن دھک دھک چل رہی ہے اس کے رُک جانے کا خوف، دل کے چاروں خانوں میں سے کسی ایک کے بند ہو جانے کا خوف، بیمار ہو جانے کا خوف۔ گاڑی چلاتے ہوئے سفر میں ایکسیڈنٹ کا خوف، گھر میں سیڑھیاں چڑھتے اور اُترتے گر جانے کا خوف، صاف زمین پر چلتے

ہوئے اچانک پھسل جانے کا خوف، شادی ہو جانے کے بعد بچے ہونے یا نہ ہونے کا خوف، اگر ہو جائیں تو اُن کی تربیت کا خوف، اگر نہ ہوں تو لوگوں اور اہل دُنیا کی باتوں کا خوف کہ یہ تو نامرد ہے اس کے ہاں تو اُولاد نہیں ہو رہی اِس میں نقص ہے یا اس کی بیوی میں۔ گھروں میں بیٹھی بیٹیوں اور بہنوں کے رشتے نہ ہونے کا خوف، طوائف کے کوٹھے پر جانے کا خوف وہاں بیٹھ کر شراب پینے کا خوف، جوئے میں ہار جانے کا خوف، گناہ کرنے کا خوف، گناہ نہ کرنے کا خوف، سردیاں آنے اور گرم کپڑے نہ ہونے کا خوف، فقیروں کا سڑک پر پڑے ہوئے سردی میں ٹھٹھر کر مر جانے کا خوف، گرمیوں میں شدید گرمی اور لُو لگنے کا خوف، دورانِ سفر جہاز کے گرنے کا خوف، سمندری جہازوں میں سفر کرتے ہوئے شدید طوفان آ جانے کا خوف۔

ماں باپ سے ڈانٹ کھانے کا خوف بھلے کوئی بھی عمر ہو، ماں باپ کے سامنے بچہ ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے، بھلے وہ ساٹھ برس کا ہی کیوں نہ ہو جائے، پھر بھی وہ اپنے باپ سے ڈرتا ہے، اگر وہ شریف النفس ہے، تابیدار ہے، اگر اُس نے سورہ لقمان پڑھ رکھی ہے جس میں کہ بار بار کہا گیا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کرو دونوں بوڑھے ہو جائیں یا دونوں میں سے ایک بوڑھا ہو تو اُن کے سامنے اُف تک نہ کرو، مگر ایسا ہوتا نہیں انسان خطا کا پتلا ہے، خوف سے بھرا ہوا ہے۔

انسان مجسم خوف ہے اور یہ خوف اُس کو موت تک رہتا ہے موت کے بعد بھی اُسے خوف سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا، قبر میں حساب دینے کا خوف، دُنیا میں زندہ رہتے ہوئے ایسے اعمال جو کہ اُس کے گھر والوں کو بھی معلوم نہیں تھے، چھپا کر اُس نے وہ اعمال کئے تھے کیونکہ اُس کو دُنیا کا خوف تھا کہ دُنیا کیا کہے گی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا، جھوٹ بولا، کسی کا حق مارا، کسی سے وعدہ خلافی کی، کسی کا مال ناجائز قبضے میں کر لیا ایسے تمام خوف اُسے دُنیا سے تھے اپنے رب کا خوف نہیں تھا۔ کیسی حیرانگی کی بات ہے کہ وہ دُنیا سے چھپ کر تو غلط کام کرتا رہا اور دُنیا کے خوف سے ڈرتا رہا مگر اُسے اللہ کا خوف نہیں تھا، وہ اللہ سے نہیں ڈرتا تھا جس نے کہ اُسے چھوٹ دے رکھی تھی مرنے تک مگر وہ اِس خوف سے ماوراتھا جس کا کہ اصل خوف ہونا چاہیے تھا زندگی میں۔ انسان کیسا بیوقوف ہے ہر قسم کے خوف میں مبتلا رہتا ہے مگر اللہ سے نہیں ڈرتا۔

آج کے دور میں جو موجودہ صورتحال ہے اِس میں پوری دُنیا خوف میں مبتلا ہے اور وہ خوف ہے کورونا کا، ایک ایسا جرثومہ جو نظر بھی نہیں آتا اُس نے پوری بنی نوع انسان کو ایک نقطے پر لا کر جمع کر دیا ہے، بلا کسی رنگ و نسل، دین و مذہب کہ صرف کورونا کا خوف، کورونا سے بچیں، ایک دوسرے سے چھ چھ فٹ کا فاصلہ رکھیں، چہروں پر ماسک پہنیں، ایک دوسرے سے ہاتھ مت ملائیں، بار بار ہاتھوں کو دھوئیں تا کہ اپنی زندگی بچا سکیں۔ کتنے بیوقوف لوگ ہیں ہم یہ بات بھول رہے ہیں کہ جو بھی انسان پیدا ہوا ہے جو بھی ذی روح ہے اُس کی جان نکلنی ہے، کسی نہ کسی بہانے سے، کسی نہ کسی بیماری سے، کسی نہ کسی حادثے سے، کسی نہ کسی واقعے سے، کسی نہ کسی خوف سے، کیونکہ یہ خوف کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ خوف اُسی دن ختم ہو گا جب پوری کائنات روئی کے گالوں کی طرح فضاء میں بکھیر دی جائے گی، سمندروں کا پانی اُلٹ دیا جائے گا، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضاء میں اُڑنے لگیں گے تب شاید یہ خوف ختم ہو سکے۔ ورنہ مجھے نہیں لگتا کہ بنی نوع انسان خوف سے کبھی بھی چھٹکارا یا رہائی پا سکے گا، ایک لمحے کے لئے آپ بھی سوچیں اور میں بھی سوچوں کہ اس وقت ہم کس خوف میں مبتلا ہیں، اپنی اپنی حیثیتوں میں، ہر طرف خوف ہی خوف ہے۔۔۔

خودکشی

اُس نے 1940ء میں میٹرک پاس کیا، عمر 16 برس تھی، یہ اپنے چھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا بھائی تھا اور چھ بھائیوں میں سے دوسرا ایسا بھائی تھا جس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی، باقی اُس کے جو چار بڑے بھائی تھے وہ درزی کا کام کرتے تھے۔ 1940ء میں آپ سوچیں ایک ٹیلر ماسٹر ایک جوڑے کی سلائی کتنی لیتا ہوگا؟ جو بہت اچھا ٹیلر ماسٹر ہوتا تھا وہ جوڑے کی سلائی چار آنے لیا کرتا تھا اور جو نارمل درزی تھے وہ دو آنے لیا کرتے تھے۔ اسے اپنے بھائیوں کے کام سے نفرت تھی اس لئے اس نے میٹرک تک پڑھائی کی اور اُس کے بعد اپنے بڑے بھائی جو کہ ایم ای ایس میں کلرک تھا انکے پاس چلا گیا۔ بھائی نے وہاں اپنے انچارج میجر سے سفارش کروا کر اسے بھی ملازمت دلوادی پھر یہ وہاں کوئٹہ میں 1940ء سے لے کر 1945ء تک ملازم رہا۔

یہ وہ دور تھا جبکہ دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی اور انگریز سرکار کے لئے برصغیر میں کوئٹہ اور بلوچستان کی سرحدی علاقے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ عبداللہ کو ایم ای ایس کی نوکری پسند نہ آئی بھائی کے منع کرنے کے باوجود ایم ای ایس کوئٹہ میں 1945ء میں استعفیٰ دے کر واپس گاؤں آگیا اب اس کی عمر 21 برس ہو چکی تھی، گھر میں سب سے چھوٹا تھا، ماں فوت ہو چکی تھیں، سب بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، باپ ابھی زندہ تھا اور اپنے والد کا بہت لاڈلہ تھا عبداللہ۔ گھر چھوٹا تھا، ایک بیٹھک جو کہ گھر کے داخلی دروازے کے ساتھ منسلک تھی، چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی اور پیچھے دو کچے کمرے تھے، اور اُن کچے کمروں میں گھپ اندھیرا رہتا تھا کیونکہ گھر کا صحن پورا ڈھانپا ہوا تھا، اِس لئے سورج کی روشنی نیچے صحن تک نہیں پہنچتی تھی۔ اُس دور میں ان کے گھر میں بجلی بھی نہیں آئی تھی، شام کو عبداللہ کی بھابھیاں ایک لمبے سے ڈنڈے پر لوہے کی بوتل رکھ کر اور اُس میں سرسوں کا تیل ڈال کر روئی کی بتی بنا کر جلایا کرتی تھیں جو کہ لیمپ کا کام دیتا تھا اور گھر میں روشنی کا انتظام ہو جاتا تھا۔ اکثر کھانا مغرب کے بعد کھالیا جاتا تھا گرمی ہو یا سردی۔ سب مل جل کر اِسی چھوٹے سے گھر میں رہ رہے تھے، اوپر کے پورشن میں ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں عبداللہ اور عبداللہ کے والد رہا اور سویا کرتے تھے۔ اِسی دوران عبداللہ کے والد نے اُس کی شادی اپنے چچازاد بھائی کی

بیٹی کے ساتھ طے کردی جو کہ جلال پور جٹاں میں رہا کرتے تھے۔ عبداللہ نے باپ سے کہا، ابا جی میری تو نوکری بھی نہیں ہے میں کیسے گزارا کروں گا؟ والد نے اُسے ڈانٹا اور کہا کہ پتر رزق رب دیتا ہے میں نے بات پکی کردی ہے، اب اس میں سے کچھ بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جون 1945ء کو عبداللہ کی شادی ہوگئی، دلہن گھر آگئی، دلہن جو کہ اُس دور میں مڈل پاس تھی سلجھی ہوئی لڑکی تھی، اُس کے میکے میں دو بھائی ایک ماں اور ایک باپ تھا جس نے دُنیاداری چھوڑ دی تھی۔

شادی کے فوراً بعد عبداللہ کو ڈاکخانے میں کلرک کی ملازمت مل گئی 16 روپے ماہانہ پر۔ عبداللہ بہت خوش ہوا کیونکہ نوکری اُسے اپنے گاؤں میں ہی ملی تھی، اُس کے دفتر میں عبداللہ سمیت 3 افراد تھے، یہ تین بندے اُس دفتر کا حصہ تھے، سب پوسٹ ماسٹر منی آرڈر اور پارسل بک کیا کرتا تھا، رجسٹریاں اور آرڈنری ڈاک عبداللہ کے حوالے تھی، جب کہ پیکر کا کام یہ تھا کہ وہ منی آرڈرز رجسٹریوں اور پارسلوں پر بکنگ مہر لگایا کرتا اور روز مہر کی تاریخ تبدیل کیا کرتا تھا۔ عبداللہ اپنے کام سے خوش تھا گاؤں میں آبادی کم تھی اس لئے زیادہ رش نہیں ہوتا تھا، اکثر گاؤں کے لوگ ڈاک خانے آکر ہی اپنی ڈاک اور خطوط کا پتا کرتے تھے اگر اُن کے خط وغیرہ آئے ہوتے تو وہ خود ہی لے جاتے حالانکہ محکمے نے ایک چٹھی رساں بھی رکھا ہوا تھا تاکہ وہ گاؤں میں جاکر لوگوں کو اُن کے خطوط اور پارسل دے آیا کرے۔

عبداللہ پانچ چھ سال اپنے گاؤں میں ہی کام کرتا رہا پھر 1955ء کو اُس کا تبادلہ دوسرے گاؤں عرب علی کوٹلہ کردیا گیا جو کہ اُس کے گاؤں سے تقریباً چالیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ عبداللہ کی شادی 1945ء میں ہوئی تھی اور اب اُس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں یعنی چار بچے ہوچکے تھے، لہٰذا عبداللہ نے اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور کوٹلہ عرب علی اولڈ پوسٹ آفس Pahary Road پر رہائش اختیار کی، وہاں پر ایک دو کمرے کا مکان کرائے پر لیا پھر اپنے بچوں کے ساتھ وہاں سیٹ ہونے کی کوشش میں لگ گیا۔ اولڈ پوسٹ آفس کوٹلہ میں اُسے روزانہ پیدل جاتے ہوئے مین بازار کوٹلہ سے گزرنا پڑتا جس کی وجہ سے اُس کا کافی وقت صرف ہوجاتا جس کی وجہ سے اُس کے ایک کلرک نے جو کہ اولڈ پوسٹ آفس کوٹلہ میں ہی کام کرتا تھا نے کہا، صاحب جی ہمارے ڈاک

خانے میں دو کمرے خالی ہیں، اور آپ سب پوسٹ ماسٹر کی پوسٹ پر آئے ہیں لہٰذا آپ کا یہ حق بنتا ہے کہ اُن کمروں میں سرکاری طور پر رہائش پذیر ہو جائیں۔ عبداللہ کو اُس کی بات پسند آئی مگر عبداللہ تھوڑا بزدل بھی تھا، اُس نے ہمت کر کے کوٹلہ عرب علی کے پرانے پوسٹ آفس میں رہائش اختیار کر لی اور بڑے سکون کے ساتھ زندگی گزارنے لگ پڑا۔ گاؤں کے چوہدری، سید اور علاقے کے معزز خاندان اور پٹواری وغیرہ عبداللہ کے اچھے جان پہچان والے بن گئے، ایک پٹواری برکت علی عبداللہ کو اپنی بھینس کا خالص دودھ تین سیر روزانہ بھجوا دیا کرتا تھا، اسی طرح کوٹلہ کے مین بازار میں گوشت والے قصائی اور سبزی فروش جو کہ زیادہ تر آرائیں تھے، عبداللہ کو سستے داموں اشیاء اور گوشت دے دیا کرتے تھے۔ عبداللہ نے اپنے دو بڑے بیٹوں کو کوٹلہ کے ایک پرائیویٹ چھوٹے سے سکول میں داخل کروا دیا۔

عبداللہ 1961ء تک کوٹلہ میں بہت خوشحالی کی زندگی بسر کرتا رہا، پھر اُس نے انسپکٹر ڈاک خانہ جات کا امتحان دیا اور پاس ہو گیا اُس کی پروموشن ہو گئی، پروموشن ہونے کا مطلب تھا ٹرانسفر۔ اب 1961ء میں عبداللہ سمندری انسپکٹر ڈاک خانہ جات کے طور پر تعینات ہو گیا جو کہ لائل پور کے قریب ایک قصبہ تھا، عبداللہ کا بڑا بیٹا 14 برس کا ہو چکا تھا دوسرا آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ سمندری آ کر عبداللہ کے ہمسائے میں ایک تھانے دار اور اُس کی فیملی رہتی تھی، تھانے دار اکثر گھر سے باہر رہتا اُس کی اولاد بھی نہیں تھی اُس کی بیوی بہت خوبصورت تھی اور اُس کے دل میں میل تھی اُس نے عبداللہ کے بڑے بیٹے کو بہانے بہانے سے اپنے گھر بلانا شروع کر دیا، کبھی کہنا کہ بیٹا مجھے یہ سبزی لا دو، کبھی کہنا کہ آج دودھ ختم ہو گیا ہے دودھ لے آؤ، یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ عبداللہ کا بڑا بیٹا جو کہ ابھی لڑکپن اور جوانی کے درمیان نئی عمر میں تھا اُس عورت کے جال میں پھنس گیا۔

عبداللہ بنیادی طور پر شریف آدمی تھا اُس کو جب اِس بات کا علم ہوا تو بیٹے کو بارہا تنبیہہ کی، ڈرایا دھمکایا، مگر بیٹا باز نہ آیا اور اُس عورت کی خوبصورتی کے جال میں اس طرح سے پھنستا چلا گیا جس طرح ریشم کا کیڑا، ریشم بناتے ہوئے اپنے اوپر ریشم کی تہہ جمع کرتا رہتا ہے، اور پھر آخر میں موت کے حوالے ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سودا

مغلیہ دور میں انگریز کے برصغیر میں آنے کے بعد جب شہنشاہ جہانگیر کی بیٹی بیمار ہوئی، تو بادشاہ کے دربار میں جتنے بھی حکیم طبیب تھے، وہ سب ناکام ہو گئے اُس دور میں بادشاہ کے ایک درباری نے شہنشاہ جہانگیر سے کہا: صاحبِ عالم جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟ شہنشاہ جہانگیر بولا، کہو کیا کہتے ہو۔ تو درباری نے کہا کہ حضور ہمارے ہندوستان میں ایک فرنگی آیا ہے جو بیماریوں کا علاج بھی کرتا ہے۔ بادشاہ نے کہا! جاؤ اُس کو جلدی سے بلا کر دربار میں پیش کرو۔ درباری بھاگا بھاگا گیا اور اُس فرنگی کو لے آیا، دربار میں جب وہ فرنگی پیش ہوا تو جہانگیر نے اُسے بتایا کہ اُس کی بیٹی بیمار ہے اور بسترِ مرگ پر ہے میرے حکیم طبیب ناکام ہو چکے ہیں ایک درباری نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا، کیا تم میری بیٹی کو بچا سکو گے؟ مترجم کے ساتھ فرنگی نے کہا، بادشاہ سلامت میں کوشش کروں گا آپ مریضہ سے ملوا دیں۔ فرنگی کو مریض شہزادی سے ملانے کا اہتمام کیا گیا، فرنگی نے شہزادی کو اپنے ملک کی دوائیاں اور گولیاں پیس کر دیں اور کہا بادشاہ سلامت ایک دو دن انتظار کریں آپ کی بیٹی تندرست ہو جائے گی، پھر ایسا ہی ہوا شہزادی ٹھیک ہو گئی۔ بادشاہ نے خوشی کے عالم میں فرنگی کو اپنے دربار بلایا اور کہا، مانگو کیا مانگتے ہو میں تمھیں اپنی بیٹی کے وزن کے مطابق سونا اور ہیرے جواہرات دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر فرنگی دور بین انسان تھا، اُس نے کہا کہ نہیں بادشاہ سلامت مجھے ہیرے جواہرات نہیں چاہییں مجھے بس اتنی اجازت دے دیں کہ میرے ملک کے تاجر حضرات آپ کے ملک میں آ کر تجارت کر لیا کریں۔ جہانگیر نے کہا یہ بھی کوئی بڑی بات ہے، لو آج سے میں تمھیں یہ حکم نامہ جاری کر رہا ہوں کہ ایسٹ

انڈیا کمپنی کے نام سے جو بھی تاجر برصغیر میں آئیں گے اُن پر کوئی ٹیکس کوئی لگان نہیں لیا جائے گا وہ اپنی مرضی سے تجارت کر سکیں گے۔ یہ ساری روداد اور تاریخ آپ کو بتانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ سوچیں کہ فرنگی کتنا ہوشیار ذہنیت کے مالک لوگ تھے، اور آج تک ہیں۔

اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک آفیسر کرنل نیڈو تھا، برصغیر آیا تو ایک گجر لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا، گجروں کو جب پتا چلا تو اُنھوں نے اُسے اپنی بیٹی کا رشتہ اِس شرط پر دینے کی حامی بھری کہ وہ گجروں کی طرح زندگی گزارے گا، نیڈو نے جانور چرائے، بھینسوں کا دودھ نکالتا، ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور بالآخر مسلمان ہو کر اپنی معشوقہ سے شادی کر لی، اس کی گجر بیگم رانی جی کہلانے لگیں۔ نیڈو سمجھدار آدمی تھا، اس نے کشمیر میں جانوروں کو ذبح کرنا شروع کر دیا آہستہ آہستہ انگریز فوجیوں کو گوشت سپلائی کرنے کا ٹھیکیدار بن گیا، نیڈو کی ایک بیٹی تھی جو ماں کی طرف سے گجر تھی اور باپ کی وجہ سے انگلش زبان پر مکمل عبور رکھتی تھی، نیڈو چونکہ مذہبی لوگوں سے بہت میل جول رکھتا تھا اور پیروں کا بہت خدمت گزار تھا لہٰذا اس کی بیٹی بھی اِسی رنگ میں رنگی گئی۔ کرنل لارنس عربی زبان کا بہت بڑا محقق اور ماہر تھا، اسکی قرأت بہت اعلیٰ، معلومات انتہائی وسیع تھی، برٹش سیکرٹریٹ نے کرنل لارنس کو لاہور میں تعینات کر دیا، جلد ہی اُس کی شہرت مکہ سے آئے ہوئے بزرگ کے نام سے پھیل گئی، لوگ بڑی تعداد میں آنے لگ پڑے اور کرنل لارنس اپنے طریقہ کار سے لوگوں کو جہاد سے گمراہ کرنے لگا۔ نیڈو اپنے کام کے سلسلے میں لاہور آیا تو اِسے بھی ملنے کا اشتیاق ہوا کہ مکہ والے بزرگ سے ملاقات کی جائے، وہ مکہ والے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو جاٹوں والے لباس میں تھا۔ وہ مکی شیخ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنی لڑکی اُن کے نکاح میں دینے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ یوں یہ لڑکی کرنل لارنس المعروف شیخ مکی کی بیگم بن گئی، کرنل لارنس کے پاس انگریز معتقدین بھی آتے تھے اِن میں ایجنسیوں کے لوگ بھی تھے جن سے شیخ مکی اکیلے ملاقات فرماتے، شادی کے چند دن بعد ایسی ہی ملاقات میں شیخ مکی نے نئی زوجہ کو مہمان داری کے لئے کہا، نئی بیگم جب مشروبات لے کر کمرے میں گئی تو انگریزی میں ہونے والی تمام گفتگو سے آگاہ ہو گئی۔ اس نے خفیہ طریقے سے ایک خط اپنے باپ کو ارسال کیا، باپ فوراً لاہور پہنچا، بیٹی سے ملا اور پھر کرنل

لارنس سے مل کر اپنا سابقہ تعارف کروا کر بیٹی کو طلاق دینے اور اپنے ساتھ بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ کرنل لارنس نے نیڈو کو خاموش رہنے اور برٹش ایمپائر کی خدمت کا کہا۔ نیڈو یہاں سے مایوس ہو کر رستم زماں بھولو پہلوان کے والد کے پاس پہنچا اور اُن کو تمام کہانی سُنائی، ایمان بخش پہلوان پکا مسلمان تھا، اپنے شاگردوں کے ساتھ شیخ مکی کے پاس جا پہنچا، شیخ مکی نے اسے کوئی توجہ نہ دی دھمکیاں دی اور کہا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ، پہلوان نے شیخ کو اُٹھایا اور داتا دربار کے سامنے برگد کے درخت سے اُلٹا لٹکا دیا کہ جب تک لڑکی کو طلاق نہیں دو گے اور توبہ کر کے واپس نہیں جاؤ گے یہی لٹکے رہو گے، چوبیس گھنٹے بعد کرنل لارنس نے ہار مان لی لڑکی کو طلاق دلوا کر نیڈو کے ساتھ بھیج دیا گیا اور لارنس کو فوری طور پر برطانیہ واپس بھیج دیا گیا۔ کرنل نیڈو کی لڑکی واپس کشمیر پہنچی تو کچھ عرصے بعد اس کی شادی شیخ عبداللہ سے کر دی گئی، یوں یہ لڑکی بیگم اکبر جہاں عبداللہ کہلائیں جن کا بیٹا فاروق عبداللہ بعد میں مقبوضہ کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنا۔ نیڈو کے خاندان نے لاہور اور کشمیر میں شاندار ہوٹل کے بزنس میں خوب نام کمایا۔ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ لاہور کے موجودہ آواری ہوٹل کی جگہ پہلے نائڈوز ہوٹل تھا۔

اِس قصے کو ایک پرانی کہاوت پر ختم کرنے کو جا رہا ہوں کہ فرنگی سو سال آگے کی سوچتا ہے ہندو دو سو سال آگے کی سوچتا ہے، اور موجودہ دور کا مسلمان جب اُس کے سر پر مصیبت پڑتی ہے تو پھر سوچتا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک فرنگی طبیب نے برصغیر کے مغلیہ شہنشاہوں سے کتنی آسانی کے ساتھ پورے برصغیر کا سودا کروا لیا اور یہ سودا اُس نے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کیا۔ مگر ہم بدقسمت جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مال اور اولاد میرے اُمت کیلئے فتنہ ثابت ہو گی۔" موجودہ دور میں 56 سے زیادہ مسلم ممالک اپنے اِنہی اعمال کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کے نرغے سے باہر نہیں نکل سکے۔۔۔۔۔۔

موسم

کافی دن سے میرے ذہن کے اندر مختلف قسم کی سوچیں اور خیالات اُبھر رہے ہیں کچھ مثبت کچھ منفی، کیونکہ جب سے COVID-19 آیا ہے اِس نے پوری دُنیا میں اِنسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر کسی حد تک اِکٹھا کر دیا ہے، پوری دُنیا ایک نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وائرس ایجاد کیا گیا، سپر طاقتیں ایک جنگی ہتھیار کے طور پر تمام دُنیا کی اقتصادیات کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش یا سازش کر رہی ہیں، مگر میرے خیال کے مطابق COVID-19 اگر جان بوجھ کر بھی ایجاد کیا گیا ہے تو جنھوں نے اِس وائرس کو اِنسانیت کے خلاف استعمال کرنے کی گھناؤنی سازش کی ہے وہ ملک اور اُس کے عوام بھی اس ناگہانی وباء میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ رب تعالیٰ کی طرف سے عذابِ عظیم ہے، چونکہ اِس سے پہلے رب نے بڑی بڑی ترقی یافتہ تہذیبوں کو نیست و نابود کیا ہے جن کا تذکرہ قرآن پاک میں اور بے شمار مقامات پر رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہنے کو یہ COVID-19 ایک وائرس ہے جو کہ نظر نہیں آتا کتنی خاموشی کے ساتھ ایک انسان سے دوسرے انسان تک منتقل ہوتا جا رہا ہے، ایک ملک سے دوسرے ملک تک، ایک معیشت سے دوسری معیشت تک منتقل ہو رہا ہے۔ یہ جنوری 2020ء سے شروع ہوا یہ بیماری خاص طور پر 50 برس سے اوپر والے لوگوں پر جلدی اٹیک کرتی ہے یہ تقریباً دو سے تین ہفتوں کے اندر اِنسانی جسم میں داخل ہو کر جان لیوا ثابت ہوتا ہے، خاص طور پر جن لوگوں کی قوت مدافعت کم ہوتی ہے۔

بات آپ سے موسم کی کرنی تھی، دل کا موسم مجھے کس طرف لے گیا، میں نے تو آپ کے ساتھ گرمیوں کے موسم کی بات کرنی تھی، جس کے اندر شدید گرمی حبس ہو جاتا ہے اور پھر گھروں کی بجلی بند ہو جاتی ہے، لوڈشیڈنگ شروع ہو جاتی ہے، غریب لوگ اور غربت کی سطح سے نیچے رہنے والے

لوگ بے بسی کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر ساون، بھادوں کی جبس، اور بارشیں اکثر گھروں اور ان کے مکینوں کو سیلاب میں بہالے جاتی ہیں، میں نے تو بات کرنی تھی آپ سے خزاں کے موسم کی جس میں درخت اور پودے بے لباس ہو جاتے ہیں، وقت کے ساتھ پتہ پتہ شاخوں سے زرد ہو کر زمین بوس ہو جاتا ہے، میں نے تو بات کرنی تھی آپ سے سخت سرد راتوں کی جس میں گھپ اندھیرا اور دھند پورے ماحول کو اپنے لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور غریب لوگ اِن سوکھے پتوں اور درختوں کی سوکھی ٹہنیوں کو جلا کر اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو سردیوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کئی لوگ غربت افلاس اور کسمپرسی کی حالت میں اِس شدید موسم میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں میں نے تو بات کرنی تھی شمالی علاقوں پر برف باری کا لطف اُٹھانے والے امیر لوگوں کی جو اپنی گاڑیاں نکال کر شمالی علاقوں کی طرف بھاگ پڑتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کی اِس عیاشی کے پیچھے کتنے لوگ اپنے آپ کو اِحساسِ کمتری کا شکار کر لیتے ہیں۔ اِس موسم میں پورے معاشرے میں احساس محرومی، دُکھ اور یاسیت کا موسم پیدا ہو جاتا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے تو فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے گھر میں کوئی کھانے کی چیزیں یا پھل لے کر آئے تو اُس کے چھلکے بھی اپنے گھر کے باہر نہ پھینکے کیونکہ اگر اُس نے ایسا کیا تو شاید اُس کے ہمسائے میں جو لوگ بستے ہیں وہ اتنی استطاعت نہیں رکھتے ہوں تو اُن کو اور اُن کے بچوں کو دُکھ اور افسوس ہوگا۔ نبی کریم ﷺ جو کہ دُنیا میں افضل ترین انسان اور رب العالمین کے مطابق رحمت العالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں، اُن کا اُسوۂ حسنہ پوری انسانیت کے لئے مشعل راہ ہے اور جو ''موسم'' نبی کریم ﷺ کے کردار سے پوری دُنیا میں قائم ہوا ہے، اگر ہم سب اس کے اندر رہنا شروع کر دیں تو بغیر کسی مذہبی اور دُنیاوی تفریق کے سب کچھ خوبصورت خوشحال، پُرامن اور پُرسکون ہو جائے گا، ساری دُنیا کا موسم ساری بنی نوع انسان کا موسم، کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گا، کوئی ظلم نہیں کرے گا، ہر جگہ ہر مقام پر برابری اور مساوات کا موسم قائم رہے گا اور تمام دُنیا سے احساس محرومی ختم ہو جائے گا۔ آیئے ایک لمحے کے لئے سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر، اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھیں، جو کہ سب سے بہترین موسم، پیار کا موسم ہے۔

وقت اور تلاش

وہ آفس میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا، ایک ٹیبل پر اعظم تھا دوسرے پر عامر، عامر کے ساتھ والے ٹیبل پر ناصر بیٹھا ہوتا تھا جو کہ ڈاک ریسو کرتا تھا، وہ والی ڈاک جو کہ پوسٹ آفس اور Courier Services کے ذریعے اُس کے آفس آیا کرتی تھی۔
اس کے سیکشن کا کام یہ تھا کہ جتنی بھی ڈاک اِن اور آوٹ ہوتی تھی وہ ساری کی ساری اس کے سیکشن کی ذمہ داری تھی اور اس کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ ہر کلرک کے پاس ڈاک تقسیم کرنے کا ایک سسٹم بنایا گیا تھا، جس کے مطابق اِس کے آفس میں ایک پجن ہول تھا جس میں سارا دن مختلف ڈاک آتی تو وہ اِن خانوں میں سارٹ آوٹ کی جاتی۔ ایک خانے میں صرف فیلڈز کی ڈاک رکھی جاتی، ایک خانے میں ایم ڈی صاحب کی ڈاک رکھی جاتی، اِسی طرح باقی خانوں میں ایڈمن ایچ آر اور آئی ٹی کمرشل ڈرلنگ اور اکاؤنٹس آڈٹ والوں کی ڈاک رکھی جاتی۔
وہ آجکل ایچ آر کی طرف سے اپنی ریٹائرمنٹ کے نوٹیفیکشن کا منتظر تھا اُس نے اپنے ماتحتوں کو یہ بتایا ہوا تھا کہ جب بھی اُس کے نام کا نوٹیفیکشن جاری ہو اور آر اینڈ آئی میں جب کاپی آئے تو اُسے فوری طور پر دے دی جائے۔ اگر وہ چھٹی پر ہو تو اُسے وہ کاپی واٹس ایپ کر دی جائے، اُس کے Immediate Boss جن کا نام غلام محمد تھا، اُن کو سب لوگ جی ایم کے نام سے بلاتے تھے اُن کے ساتھ اس کی بڑی اچھی Under Standing تھی۔ وہ دونوں صبح دس بجے کینٹین چلے جایا کرتے وہاں اکٹھے بیٹھ کر چائے پیا کرتے، گپ شپ لگاتے اور سگریٹ پیا کرتے۔ اسے سگریٹ پینے کی کوئی Regular عادت نہیں تھی، مگر پھر بھی جی ایم کے ساتھ بیٹھ کر تین تین سگریٹ پی جایا کرتا اور سگریٹ بھی جی ایم سے لے کر پیا کرتا تھا، یہ اور بات تھی کہ وہ جی ایم کو ہفتے

میں Gold Leaf کی چار ڈبیاں لے کر دیا کرتا تھا۔

اُسے اِس ادارے میں آئے 25 برس ہو چکے تھے اِس سے پہلے وہ پوسٹ آفس میں چھ برس اور چار مہینے لگا کر آیا تھا، پھر Through Proper Channel اس نے اپنا ادارہ بدل دیا اور اب اس کی ریٹائرمنٹ نزدیک آگئی تھی۔ ریٹائرمنٹ سے چار ماہ قبل ایچ آر والے ریٹائرمنٹ کا نوٹس جاری کر دیا کرتے ہیں پھر چار ماہ کے اندر اندر پرسنل فائل کا آڈٹ اور کلیئرنس کی جاتی اگر کوئی Disciplinary Action نہ ہو فائل میں Red Entry نہ ہوئی ہو تو Clearance بڑے آرام سے ہو جاتی۔ پھر بھی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ تمام کام آرام سے کلیئر ہو جائیں تا کہ کوئی ذہنی اذیت نہ اُٹھانی پڑے۔ خدا خدا کر کے ریٹائرمنٹ کا نوٹیفکیشن جاری ہو گیا یہ بہت خوش ہوا اور اپنے ساتھیوں کو ہنس کر کہنے لگا، یار آپ لوگوں نے مجھے جب فئیر ویل پارٹی دینی ہے تو اُس میں مجھے جائے نماز، قرآن پاک، ٹوپی اور تسبیح اس طرح کی کوئی چیز مت دینا میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی فئیر ویل پارٹی کے اخراجات خود برداشت کروں آپ لوگوں پر بوجھ نہ بنوں کیونکہ مجھے 31 برس چار مہینے اور دس دن ہو چکے ہیں سرکاری نوکری کرتے ہوئے اور اِن تمام برسوں مہینوں اور دِنوں میں جتنے بھی لوگ مجھ سے پہلے ریٹائر ہوئے ہیں ہمارے سیکشن میں، ہم نے ہمیشہ اُن کی ریٹائرمنٹ پر پارٹی دیتے ہوئے پیسے جمع کرنے پر جھگڑا کیا ہے کبھی 50 روپے کبھی 100 روپے پر، خدا کے لئے میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ بھی آپ لوگوں کا ایسا ہی رویہ ہو میں تلخ یادیں لے کر ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ اِس بات پر عامر نے بڑا قہقہہ لگایا اور بولا، نہیں نہیں ایسے نہیں ہوگا، آپ ہم سے بڑے ہو سینئر ہو، دوست ہو، ہمارے بھائی ہو۔ آفس میں بیٹھے تمام چھوٹے بڑوں کی یہی رائے تھی، نہیں نہیں ہم خود پارٹی کا اہتمام کریں گے کورونا کے باوجود ہم یہ پارٹی کریں گے اور آفس میں نہیں کریں گے آفس سے باہر کسی اچھی جگہ پر بیٹھ کر آپ کو اچھے طریقے سے خدا حافظ کہیں گے۔

جب اُس کے ہاتھ میں ریٹائرمنٹ کا نوٹیفکیشن آیا جس میں کہ بتایا گیا تھا کہ عارف 18 جنوری 2021ء سے اِس ادارے سے ریٹائرڈ ہو جائے گا اور اُس کا نام پے رول سے نکال کر پینشن اور

ریٹائرڈ سٹاف میں شامل کر دیا جائے گا۔ مزید یہ بھی لکھا تھا کہ اُس کا، اُس کی بیوی اور بیٹی کا میڈیکل ادارے کی ذمہ داری ہوگی، اور ادارے کی پالیسی کے مطابق پینشن اور کمیوٹیشن اُس کی Basic تنخواہ کی بنیاد پر ادا کی جائے گی۔ جب وہ یہ سب پڑھ رہا تھا تو اچانک وہ ماضی کے جھرونکوں میں چلا گیا، جب آج سے 31 برس پہلے وہ ڈاک خانے میں یوڈی سی یعنی Upper Division Clerk بھرتی ہوا تھا اور اُس کی پہلی تنخواہ 1491 روپے تھی اُس کے ایک سال بعد اُس کی شادی ہوگئی تھی اور شادی کے ایک برس بعد رب تعالیٰ نے اُسے ایک خوبصورت بیٹی کی سے نوازا تھا، آج اس بیٹی اُس کی شادی ہو چکی ہے وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی ہے اور ایک ڈاکٹر ہے۔ بیٹی کے پیدا ہونے کے تین سال بعد عارف کو رب نے بیٹے کی نعمت بھی عطا فرمائی، اور وہ بیٹا آج ایم فِل پارٹ ٹو میں ہے، پھر شادی کے 12 برس بعد اُس کے ہاں دوسری بیٹی پیدا ہوئی جو کہ اب سیکنڈ ایئر کے امتحانات کی تیاری کر رہی ہے۔ نوکری کے شروع کے دن اُس کے لئے کافی مشکل تھے کیونکہ تنخواہ کم تھی اور گھر کا خرچہ چلانے میں کافی دشواری پیش آتی تھی۔ والدین ساتھ رہتے تھے جس کی وجہ سے گھر کا نظام احسن طریقے سے چلتا رہا۔

وقت پانی کی طرح بہتا رہا بڑھاپا جوانی کی دہلیز پار کر کے اُس کی روح اور جسم میں سرائیت کرتا چلا گیا مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری آج وہ جس مقام پر تھا بڑا مطمئن سرشار اور خوشحال تھا، اِن 31 برسوں میں اُس نے اپنے بہت سے پیارے رشتے کھو دیئے تھے جن میں ماں باپ، ساس سسر، بڑا بھائی۔ اُس کی بیوی شادی کے اڑھائی برس بعد ہی کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہوگئی تھی آج تک اُس کے ساتھ یہ بیماری چل رہی ہے۔ اُس کو ماضی کے جھرونکوں میں اپنے ناکام عشق بھی یاد آ رہے تھے کیونکہ جب بھی اُس نے کسی خوبصورت چہرے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہوا، گو کہ اُس کے تعلقات اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بہت اطمینان بخش تھے مگر وہ اندر سے بہت بے چین رہا اور یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔ وہ اپنے اندر اپنے آپ کی تلاش میں گم رہا اُسے ایسا کوئی نہ مل سکا جو اُس کی وحشتوں کا ساتھی ہوتا، اُس کے دل کی تاریکیوں کو روشن کرتا، اُس کے عشق کے کاسے میں اپنے حسن کی خیرات ڈالتا، مگر اُس نے آج تک اِس چیز کا

احساس اپنے بیوی بچوں کو نہیں ہونے دیا۔ اُس کی بیوی بڑی جہاں دیدہ تھی جانتی تھی کہ وہ اندر سے اکیلا ہے مگر اُس نے کبھی اِس بارے میں بات نہیں کی، عارف کے جتنے بھی عشق کے قصے اور کہانیاں تھیں وہ جانتی تھی اُسے سب باتوں کا علم تھا، اُس کے باوجود اُس نے ایک باوفا بیوی ہونے کا ثبوت دیا اور عارف کو اور اپنے بچوں کو بڑے احسن طریقے سے سنبھالے رکھا۔ مگر عارف کبھی کبھی شدید ڈپریشن میں چلا جاتا اور کئی کئی دن کمرے سے باہر نہ نکلتا، نہ آفس جاتا، اپنا فون بند کر دیتا، مشکل سے تھوڑا بہت کھانا کھاتا اور اینٹی ڈپریشن کی گولیاں کھا کر سویا رہتا۔

آج جب اُسے اپنی ریٹائرمنٹ کا نوٹیفکیشن ملا تو اُسے ایسے لگا جیسے اُسے یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ بھائی صاحب اب آپ سٹھیا گئے ہیں شاید اب آپ کی اِس دُنیا کو ضرورت نہیں رہی، مگر عارف کے اندر ابھی زندہ رہنے کی خواہش تھی ابھی تو وہ اپنے Soul Mate کی تلاش میں تھا۔ وہ اندر سے خوش ہو رہا تھا کہ چلو اب اطمینان سے میں اپنے رب سے کہوں گا، (ربا میرا یار ملا دے) جو میری خاموشی کو بھی سمجھے، مجھے اپنے ساتھ لے کر چلے، میری نگاہوں کی گفتگو کا جواب دے، میری یاسیت میری کامیابیوں میری ناکامیوں میری خامیوں اور خوبیوں سمیت مجھے قبول کرے، بھلے اِس کے لئے مجھے گھر چھوڑنا پڑے، بن واس لینا پڑے۔ ابھی عارف اِسی خیال میں گم تھا کہ اچانک جی ایم صاحب کی آواز اُس کے کانوں میں آئی، عارف ظہر کی نماز کا ٹائم ہو رہا ہے، چل یار اُٹھ وضو کر تُو نے ابھی اذان بھی دینی ہوگی، عارف ایک دم چونکا اپنی ریٹائرمنٹ کا نوٹیفکیشن ٹیبل کی دراز میں رکھا اور اُٹھ کر وضو کرنے کے لئے واش روم چلا گیا۔--------

نامرد

اُس کا گھر حضرت میاں میرؒ کے دربار کے قریب گورنمنٹ تنویر اسلامیہ گرلز ہائی سکول سکندر روڈ پر واقعہ تھا۔ عابد مسجدِ حسینؓ سے عصر کی نماز پڑھ کر باہر نکل رہا تھا ابھی زبان پر تسبیح جاری تھی کہ اُسے علی کا فون آیا، مسجد میں ہونے کی وجہ سے عابد نے فون Silent پر رکھا ہوا تھا Vibration کی وجہ سے اُس نے جیب سے فون نکالا اور ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے علی بول رہا تھا، عابد کدھر ہو؟ اُس نے کہا یار ادھر ہی ہوں، کیا ہو گیا ہے؟ دوسری طرف سے علی بولا، یار آج خاں صاحب نے بلایا ہے۔ عابد تھوڑا سا مسکرایا اور کہنے لگا او چول آدمی کچھ خدا کا خوف کر، ابھی تو میں عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آرہا ہوں، اور تو مجھے خاں صاحب کی طرف بلا رہا ہے۔ علی نے کہا یہ باتیں سب چھوڑ شام ساڑھے چھ بجے تو نے تیار رہنا ہے اور ہاں ایسا کرنا کہ اپنے گھر سے باہر نکل کر اپر مال والی روڈ پر آجانا، اور یار تو گلی نمبر 02، کپس سی ایس ایس اپر مال کے باہر کھڑے ہو جانا، میں تمھیں وہاں سے اُٹھا لوں گا، اور یہ بتا سوٹے کا انتظام ہے نہ کوئی؟ عابد بولا ہاں یار ہو جائے گا ٹھیک ہے لیکن علی یار بات سُن یار میں نے ماں جی کو ڈاکٹر کو چیک کروانا تھا کیونکہ اُن کی طبیعت کچھ دن سے خراب ہے۔ علی نے کہا یار تو چھوٹے بھائی کو ماں جی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج دینا میں ساڑھے چھ بجے تجھے اُٹھا رہا ہوں بس۔ اور فون بند ہو گیا۔

عابد خاموشی سے اپنے گھر آیا بیگم سے پوچھا، یار کوئی چائے شائے ملے گی، اُس کی بیگم اچھی قبول صورت تھی، دو بچے تھے عابد کے، حسین پانچویں میں اور عباس کلاس ون میں تھا۔ زینب نے

چائے بنانا شروع کردی اور عابد سے کہا، آج امی جی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے آپ کو یاد ہے نہ؟ عابد نے کہا، ہاں ہاں مجھے یاد ہے لیکن ایسا کرو زاہد کو فون کر دو وہ آفس سے آتا ہوا ہماری طرف آجائے اور اماں جی کو ڈاکٹر کے پاس لے جا کر چیک کرا دے۔ زینب نے حیرانگی سے پوچھا، کیا آپ نہیں جا رہے؟ ہاں وہ نہیں نہیں اصل میں، عابد تھوڑا ڈگ مگایا۔ وہ اصل میں مجھے علی کا فون آگیا ہے اُس نے اصرار کیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو گے اس لئے میں نے ساڑھے چھ اُس کے ساتھ جانا ہے۔ اچھا چائے لے آئی ہے تو ایسا کرو تھوڑی سی بھوک لگ رہی ہے کوئی چیز ہے چائے کے ساتھ کھانے کے لئے؟ زینب نے کہا میں کچھ دیکھتی ہوں شاید بسکٹ کا کوئی رول پڑا ہو گا ایک تو آپ کے بچے جو ہیں نہ یہ کوئی چیز گھر میں کھانے کی چھوڑتے نہیں ہیں۔ وہ جلدی سے بورچی خانے میں گئی اور پلاسٹک کی ایک بڑی سی بوتل میں سے بسکٹ کا ایک رول نکال کر لے آئی۔ عابد نے دیکھا بسکٹ کا رول جو کہ نمکین تھا۔ اُس نے کہا، زینب اس کو مت کھولنا میں نے نہیں یہ کھانا بس خالی چائے ہی کافی ہے۔ عابد نے جلدی سی چائے پی چائے پینے کے بعد سگریٹ سلگایا اور سگریٹ پینے کے بعد واش روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واش روم سے آواز لگائی زینب پانی نہیں آرہا، کیا پانی ختم ہو گیا ہے، ٹینکی میں؟ زینب گھبرائی اور کہنے لگی اچھا میں مشین چلاتی ہوں، آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔ عابد کو غصہ تو بہت آیا مگر کیا کرتا چاروں ناچار اُسے پانچ دس منٹ انتظار کرنا پڑا، پھر وہ نہا کر پندرہ بیس منٹ کے بعد باہر نکلا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عابد کا چھوٹا سا گھر تھا دو کمروں کا، ایک چھوٹا سا صحن تھا ساتھ میں باورچی خانہ۔ بیڈ روم سے واش روم کے لئے اُنھیں صحن میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ خیر اتنے میں شام کے چھ بج چکے تھے، عابد حسب وعدہ اپر مال گلی نمبر 02 کیپس سی ایس ایس اکیڈمی کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا، کوئی دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد علی آگیا اپنی کالی ہنڈا سیوک میں، دروازہ کھولا عابد جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور ایک دم سے علی سے غصے کی ٹون میں بولا، یار یہ کیا تماشا ہے اب کدھر جانا ہے آج؟ علی نے کہا، یار تجھے بتا یا تو ہے خاں صاحب کے پاس جانا ہے دو نئے دانے آئے ہیں بڑے خاص قسم کے، ارے تو دیکھے گا تو ٹُن ہو جائے گا۔ عابد نے کہا، چھوڑ میرا موڈ نہیں ہے آج۔ علی نے کہا یار مجھے خاں صاحب کی

بیگم نے خاص طور پر فون کیا ہے کہ آئیں بڑا خاص مال آیا ہے۔

علی نے گاڑی گلبرگ کی طرف دوڑا دی، مال روڈ سے ہوتے ہوئے، کنال روڈ فیض احمد فیض انڈر پاس کے نیچے سے ہوتے ہوئے، French Center کے پاس آ کر گلی نمبر 02 میں داخل ہو کر اپنے دائیں ہاتھ کے مکان نمبر 04 کے گیٹ کے باہر جا کر گاڑی کا ہارن دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سکیورٹی گارڈ باہر آیا اُس نے دونوں کو غور سے دیکھا پھر گیٹ کھول دیا، گاڑی ہم آرام سے اندر لے گئے، اندر ایک سلوپ بنا ہوا تھا، یہ سلوپ سیدھا بیس منٹ میں جاتا تھا جہاں پر گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔ علی نے اطمینان سے وہاں گاڑی پارک کی، میں گاڑی سے باہر نکلا، علی نے گاڑی لاک کرنے سے پہلے سگریٹ لائیٹر اور اپنے تیس بور کا پستول جیب میں رکھ لیا۔ میں نے علی سے پوچھا یہ کیا؟ کہتا تجھے پتا نہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو تھوڑی احتیاط ہونی چاہیے۔ ہم بیس منٹ سے ہو کر پہلے فلور میں گئے، وہاں پر خاں صاحب کی بیگم ہماری منتظر تھیں اور خاں صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ خاں صاحب کی بیگم بہت خوبصورت تھیں، میں پہلے بھی ایک دو دفعہ علی کے ساتھ خاں صاحب کے ڈیرے پر آ چکا تھا، پہلے یہ لوگ بحریہ میں رہا کرتے تھے اب اِنھوں نے اپنے ٹھکانہ بدل لیا تھا، خاں صاحب کی بیگم بڑی خوش اسلوبی سے ملیں ہمیں اندر کمرے میں لے گئیں۔

کمرے کا ماحول بڑا رومینٹک تھا، ڈم لائٹس چل رہی تھیں، ڈسکو میوزک ہلکا ہلکا بج رہا تھا۔ علی نے تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خاں صاحب کی بیگم سے پوچھا، وہ نئے پرندے تو دکھائیں جن کی آپ بڑی تعریف کر رہی تھیں ہمیں تو آپ بھی بہت پیاری لگتی ہیں۔ خاں صاحب کی بیگم مسکرائی اور تھوڑا سا شرمائی بھی۔ نہیں علی اب ہم میں وہ بات کہاں۔ اتنے میں تین چار لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں، ایک دو کے بال کھلے ہوئے تھے اور اُنھوں نے چست لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

وہاں پر ایک لڑکا اور بھی تھا جو کہ پٹھان تھا اور شاہ صاحب کا ملازم تھا اُس نے میوزک تیز کر دیا، ڈسکو لائٹس آن کر دی گئیں۔ ہم دونوں کو ایک ایک چھوٹی سی باریک سی گولی پکڑا دی گئی۔

میں نے علی سے پوچھا، یہ کیا ہے یار؟ علی مسکرایا، اُس نے کہا لا لے یہ کھانے سے تجھے ڈانس کرنے میں آسانی ہو گی اور تو تھکے گا نہیں یہ چائینہ کی گولی ہے بھائی۔ اُن لڑکیوں نے بھی ایک ایک گولی

لے لی پھر ڈانس شروع ہو گیا، مدھم روشنی میں ڈسکو لائیٹوں کے بیچ میں میڈم نور جہاں کے پنجابی گانے پر ''وے سونے دے آ کنگنا سوداا کو جیا، دل لینا کہ دل منگنا وے سوداا کو جیا'' اس سپیڈ پر ایک لڑکی نے بہت کمال کا ڈانس کیا چونکہ میں تھوڑا خوفزدہ تھا، میں نے وہ گولی نہیں کھائی، وہ گولی میں نے جیب میں رکھ لی اور ظاہر یہ کیا کہ میں نے گولی لے لی ہے، ساتھ اُٹھ کر میں بھی ڈانس کرنے لگ پڑا، اُن میں سے کوئی بھی ایسی حسینہ نہیں تھی کہ جو بہت زیادہ خوبصورت ہوتی یا دل کو لبھاتی۔ ایک لڑکی بار بار میرے پاس آتی مجھے جپھی ڈالتی، میرے ہونٹوں سے ہونٹ ملاتی مجھے گرم کرنے کی کوشش کرتی، مگر مجھ میں کوئی ایسی تحریک پیدا نہ ہوتی جو مجھے اُس کے حسن کی طرف مائل کرتی۔ علی نے گولی لے رکھی تھی، وہ ٹن تھا آہستہ آہستہ ڈانس کر رکھا تھا، سفاری سوٹ میں ملبوس وہ بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ لڑکی جو بار بار میرے قریب آتی اُسے تھوڑی سی حیرانگی ہوئی کہ اس بندے پر اثر کیوں نہیں ہو رہا، میرے حسن کا جادو اسے کیوں نہیں پگھلا رہا؟ میں جوں کا توں بغیر کسی حرکت کے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا، شراب کی بوتل کھل چکی تھی، ریگل شیواز کا ایک پیگ مجھے بھی دیا گیا یہ میری پسندیدہ شراب ہے، میں نے آہستہ آہستہ جام پینا شروع کیا۔

اس سارے عمل کو تقریباً گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا، خاں صاحب کی بیگم جو کہ بہت جہاں دیدہ خاتون تھیں میرے پاس آئیں، میں تھوڑا سا ٹن ہو چکا تھا لیکن اپنے قابو میں تھا۔ مجھ سے کہا، عابد کیا بات ہے بچی نہیں پسند آئی؟ میں نے کہا، نہیں کوئی ایسی بات نہیں بس جی نہیں کر رہا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں، وہاں پر ایک نوخیز دوشیزا بیٹھی ہوئی تھی ایسے لگ رہا تھا جیسے کمرے میں چودھویں کا چاند چمک رہا ہو۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ہاتھ میں شراب کا گلاس ختم ہو چکا تھا۔

میں نے خاں صاحب کی بیگم سے کہا، اس میں مجھے تھوڑی شراب دے دیجئے، اُنھوں نے پوچھا پانی ڈالنا ہے کہ سوڈا؟ میں نے کہا، نہیں مجھے پانی کے ساتھ دو۔ میں نے اُن سے جام لیا، خاں صاحب کی بیگم سمجھ گئیں کہ اب تیر نشانے پر لگا ہے، باہر ڈانس کا ہلا گلا چل رہا تھا میڈم کے گانوں پر دھوم مچائی جا رہی تھی ''سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا، انج لگدا جیویں ماہی مینوں

ہیر بناون آ گیا'' میں آہستگی کے ساتھ اُس لڑکی کے پاس گیا، بیٹھ گیا، اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا، اور پوچھا آپ کا نام؟ اُس نے کہا نام میں کیا رکھا ہے، آپ کو تو میرے بدن سے کام ہے نہ اُس نے اپنا لباس بدن سے جدا کرنا شروع کیا، اُس کے سانولے سلونے بدن پر میری نظر پھسل رہی تھی وہ کمر کر کے میری طرف کھڑی ہو گئی، پھر وہ میری طرف مڑی میری قمیص کے بٹن کھولنے لگی۔ میں نے شراب کا ایک گھونٹ لیا، اور گلاس ٹیبل پر رکھ دیا، اُس نے میری قمیص اُتاری، میری بنیان جو کہ دو جگہ سے پھٹی ہوئی تھی، اُس نے اُن سوراخوں پر ہاتھ رکھا اور انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکراتے ہوئی بولی، ارے آپ تو پینچر ہیں۔ میں مسکرایا اور کہا ہر شخص زندگی میں پینچر ہوتا ہے، آپ بھی تو پینچر ہوں گی نہ، اس کام میں کیوں پڑیں؟

کہنے لگی چھوڑیئے، آپ جس کام کے لئے آئے ہیں وہ کام کریں، اُس نے اپنا وجود میرے حوالے کر دیا، مگر میں ٹس نے مس نہ ہوا، اُس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا اور بولی کیا آپ انسان نہیں؟ میں نے کہا انسان ہوں، بڑا گناہ گار انسان شاید میری آخرت میں بھی بخشش نہ ہو۔ اُس نے کہا آج تک کوئی بھی میرے سحر سے بچ کر نہیں نکل سکا مگر آپ تو۔۔۔ آپ شادی شدہ ہیں؟ اچانک اُس کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا، میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگی، بچے؟ میں نے کہا، ہاں دو بیٹے، بولی تو پھر۔۔۔۔ میں نے کہا، پھر کیا پھر۔ مجھے پسینے آ رہے تھے، میرا ہاتھ پھر جام کی طرف بڑھ گیا باقی شراب میں نے ایک گھونٹ میں پی لی، قمیص اُٹھائی اور ایک دم سے باہر بھاگ پڑا۔ پیچھے سے آواز آئی جس میں طنزیہ قہقہہ بھی شامل تھا، ارے نامرد کہاں جا رہے ہو ۔۔۔۔۔۔

نالائق

اعظم کے گھر کی دیوار ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ ملتی تھی اکثر اعظم کے گھر سے اُس کی ماں اور اُس کے بڑے بھائی کاظم کی لڑائی کی آوازیں آیا کرتی تھیں، کاظم اعظم سے 12 سال بڑا تھا میٹرک میں پڑھتا تھا اور بہت نالائق تھا۔ وہ مسلم ہائی سکول نمبر ایک سید پور روڈ پر واقع سکول جایا کرتا تھا۔ دسویں جماعت کا داخلہ جمع کروانے کا وقت آیا تو اُس کی والدہ رضیہ جن کو ہم خالہ رضیہ کہا کرتے تھے نے کاظم کو چالیس روپے میٹرک کے داخلے کے دیئے کہ جاؤ بیٹا یہ صبح جمع کروا دینا یہ دسویں کا داخلہ ہے۔ کاظم پڑھائی میں انتہائی نالائق تھا یہ نا صرف پورے گھر والے جانتے تھے بلکہ پورے محلے کو اس کا علم تھا۔ کاظم غلط کاموں کی طرف نکل گیا تھا بہت چھوٹی عمر میں چھپ چھپ کر سگریٹ پینا شروع کر دیئے تھے۔ خالہ رضیہ کپڑے تمام گھر والوں کے کپڑے پرات میں جمائے ہوئے گھریلو صابن میں رکھ کر دھویا کرتیں اور جب کاظم کے کپڑے دھونے کا وقت آتا تو وہ اُس کی پینٹوں کی جیبوں سے سگریٹ کا تمبا کو نکلتا، تب وہ کہاں کرتیں بڑا اُلو کا پٹھا ہے، بے غیرت ہے، میرے سے جھوٹ بولتا ہے چھپ چھپ کر سگریٹ پیتا ہے۔ مگر کاظم ایک ہی بات کہتا تھا کہ نہیں اماں میں نہیں پیتا آپ بلاوجہ شک کرتی ہو۔

خالہ رضیہ پھر اُسے کوسنے لگ پڑتیں، مگر کیا کرتیں گھر میں سب سے بڑا کاظم ہی تھا، اُس سے بڑا ایک بھائی بچپن میں ہی پیدا ہوتے فوت ہو چکا تھا پھر کاظم، چار بہنیں اور آخر میں اعظم تھا۔ کاظم کے ابا ایک دُکان پر درزی کا کام کرتے تھے وہ روزانہ صبح ساڑھے سات بجے اُٹھ کر اپنے کندھے پر سلائی مشین رکھتے اور موتی بازار میں ایک درزی کی بڑی دکان میں جا کر مردانہ کپڑے سیتے، وہ دن میں جتنا بھی کام کرتے اُس میں سے 20 فی صد دکاندار لے لیتا باقی رقم جو ساٹھ ستر روپے اُس دور میں بنتی تھی وہ گھر لے آتے۔ وہ سستا زمانہ تھا اُس وقت ڈالر پاکستان میں پانچ روپے کا تھا اور روز کے ساٹھ ستر روپے ایک مڈل کلاس گھرانے کے لئے کافی ہوا کرتے تھے مگر کاظم تھا کہ اُس کی فرمائشیں اور شوق اتنے زیادہ تھے کہ ماں سے لڑ کر روز کے بیس پچیس روپے خرچے کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ سکول کے راستے میں اُس کے تایا ابو کا گھر آتا تھا اُس کے تایا زاد بھائی جو اُس

کے ہم عمر تھے ایک دو اُس سے بڑے بھی تھے وہ اُسے اپنے گھر میں روک لیا کرتے اور کہتے، چھڈ یار آج سکول کی جانا، بیجا اتھے، پھر وہ تائے کے گھر بیٹھا رہتا اور جب چھٹی کا وقت ہوتا تو کتابیں اُٹھائے گھر واپس آجاتا۔ ماں باپ یہ سمجھتے تھے بیٹا میٹرک کی تیاری کر رہا ہے جب کافی دن گزر گئے تو ماں نے پوچھا کاظم تیرا رول نمبر آگیا سکول میں؟ تو کہتا ہے، امی جی نہیں ابھی نہیں آیا۔ ماں نے کہا، چل بیٹا دھیان رکھنا یہ نہ ہو کہ پچھلے سال کی طرح تو اس بار بھی میٹرک میں فیل ہو جائے ۔کاظم میٹرک پاس کرنے کی یہ دوسری کوشش کر رہا تھا، اُن دنوں اگر کوئی ایک مضمون میں بھی فیل ہوتا تو اُسے سارے مضامین میں فیل قرار دیا جاتا تھا کمپارٹ کی کوئی سہولت تعلیمی بورڈ والوں نے نہیں رکھی تھی۔

دن گزر رہے تھے اعظم جو کہ کاظم کا چھوٹا بھائی تھا اور میرے ساتھ گلیوں میں پھرا کرتا تھا چونکہ ابھی میں سکول داخل نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اعظم ہم دونوں صبح نو ساڑھے نو بجے اکٹھے ہوتے اور گلی میں اپنے گھر کی تھڑے پر بیٹھ جاتے کبھی لڈو کھیلتے، کبھی گلی ڈنڈہ اور گلی ڈنڈہ کھیلتے ہوئے اکثر اہل محلہ سے لڑائی بھی ہو جایا کرتی کیونکہ گلی میں آتے جاتے لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو گُلی لگ جاتی تو وہ گالیاں دینے لگ پڑتا یا مارنے کے لئے پیچھے بھاگتا۔ اُن دنوں موسم کے ساتھ کھیل تبدیل ہوا کرتے تھے پتنگ بازی کا موسم ایک دفعہ فروری مارچ کے دنوں میں شروع ہوتا اور پھر اُس کے بعد لاٹو کھیلنے کا موسم آجاتا لاٹو کے ساتھ ایک لتی ہوتی تھی وہ اُس پر باندھ دی جاتی پھر ہاتھ میں لتی کا سرا پکڑ کر زور سے زمین پر پھینکا جاتا اور لتی کھینچ لی جاتی تو لاٹو زمین پر گھومنے لگتا پھر یہ مقابلہ ہوتا کہ کس کا لاٹو سب سے دیر میں گرے گا گھومتے گھومتے۔ پھر کنچے کھیلنے کا موسم آجاتا جس کو ہم لوگ اپنی زبان میں ''بنٹے'' کہتے تھے اُس میں ایک ''کھیل چکر'' ہوتا جس میں ایک دائرہ کھینچ لیا جاتا اور دائرے کے درمیان ایک لائن لگا دی جاتی اُس لائن پر دو لڑکے اپنے اپنے کنچے رکھ کر کھیلنا شروع کرتے۔ دائرے کی لائن پر بیٹھ کر اپنے ایک کنچے کو زور سے اُس لائن والے کنچو پر مارتے اگر ایک کنچا چکر سے باہر نکل جاتا تو باری اُس لڑکے کی چلتی رہتی اور اگر کوئی کنچا اُس چکر سے باہر نہ نکلتا تو پھر دوسرے لڑکے کی باری شروع ہو جاتی اس طرح جو زیادہ کنچے باہر چکر سے نکال لیتا وہ یہ کھیل

جیت جاتا۔ پھر موسم آجاتا سگریٹ کے مختلف برانڈز کی خالی ڈبیاں جمع کرنے کا ہر خالی ڈبی کی ایک قیمت ہوتی سب سے سستی ترین ڈبی "بگلا مارکہ" سگریٹ کی تھی اور سب سے مہنگی ترین ڈبی "تھری کاسل" برانڈ کی تھی اور ان ڈبیوں کے بیچ میں گولڈ لیف، ولز، گولڈ فلیک، وڈ بائن، کے ٹو، لال ٹین، کیپسٹن، ہاتھی مارکہ، ولز کنگ اور بے شمار سگریٹس کی ڈبیاں ہم لوگ جمع کیا کرتے تھے۔ پھر کچھ دن کے بعد موسم بدلتا اور ہم لوگ سائیکل کا خالی ٹائر لے کر اُس کو چھوٹے سے ڈنڈے کے ساتھ دھکا دیتے اور ساتھ ساتھ بھاگتے اور دیکھتے کہ کون کتنی دور تک خالی سائیکل کا ٹائر بھگا سکتا ہے ڈنڈے کی مدد سے۔ پھر موسم آجاتا پٹھو گرم کا، اس میں مٹی کی پانچ چھ ٹھیکریاں لے کر اُنھیں کھڑا کیا جاتا اور سات ربڑ گیند سے اُن ٹھیکریوں کو گرانے کی کوشش کی جاتی جب وہ ٹھیکریاں گر جاتیں تو ایک لڑکا بھاگ کر آتا اور دوبارہ ٹھیکریاں کھڑی کرنے کی کوشش کرتا۔ اس دوران میں دوسرے لڑکے بھاگ کر سات ربڑ گیند کو اُس لڑکے پر مارتے کبھی کمر پر کبھی منہ پر زور سے مارتے۔ اس دوران اگر وہ کامیاب نہ ہوتا تو کوئی اور دوسرا لڑکا آتا اور اُسے مارتا اس طرح یہ کھیل چلتا رہتا۔ اس میں کبھی کبھی کسی کو گیند بہت زور کی بدن کے نازک حصوں پر بھی لگ جایا کرتی تھی۔

ایک دن میں اور اعظم گلی میں بیٹھے تھے کہ اعظم کے گھر سے اُس کی امی رضیہ خالہ کے رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں وہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں اور کاظم کو بددعائیں دے رہی تھیں کہ کاظم تیرا ککھ نہ رہے تیرا بیڑا غرق ہو جائے تو نے میرا گھر تباہ کر دیا میں تجھے پیدا ہی نہ کرتی پتا نہیں وہ کون سی بد بخت گھڑی تھی جب تو میرے گھر میں پیدا ہوا، اللہ یا مجھے اُٹھا لے یا اس کاظم کو اُٹھا لے۔ مگر کاظم تھا کہ اُسے کوئی پرواہ ہی نہیں تھی ماں دو ہاتھوں سے اُسے مار رہی تھی اور وہ آگے سے ماں کو انتہا کی غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔ میری ماں کو جب پتا چلا تو وہ رضیہ خالہ کے پاس گئیں اُن کو روکا اور چپ کرانے کی کوشش کی، دلاسہ دیا کہ بہن بچہ ہے، اللہ خیر کرے گا، ٹھیک ہو جائے گا۔ کاظم کی ماں نے روتے ہوئے بتایا کہ آج اس کی کلاس کا ایک لڑکا گھر آیا تھا اُس نے بتایا ہے کہ کاظم کا دسویں کا داخلہ نہیں گیا۔ اس وجہ سے اُسے مارا پیٹا اور خود بھی روتی پیٹتی رہیں پورے گھر میں مایوسی کی فضاء تھی جب شام کو کاظم کا باپ کندھے پر مشین رکھے گھر میں داخل ہوا تو اُس نے محسوس کیا کہ جیسے گھر

میں کوئی فوتگی ہو گئی ہو۔ اُس کی چاروں بیٹیاں کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں، ماں کا چہرہ رونے پیٹنے سے سوج چکا تھا، اعظم بستر میں گھسا ہوا تھا اور کاظم گھر میں نہیں تھا۔ باپ نے پوچھا کیا ہوا ہے خیر تو ہے؟ ماں نے صبح کا سارا قصہ بتا دیا وہ بھی بہت آزردہ ہوئے اور کاظم کو گالیاں اور بددُعائیں دینے لگ پڑے۔ اتنے میں کاظم گھر میں داخل ہوا اُس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی وہ نارمل انداز میں ماں کے قریب آیا اور کہا امی مجھے روٹی دے دو کیا پکا ہے؟ باپ نے جب یہ بات سُنی تو آپے سے باہر ہو گیا اور بیٹے کو خوب مارا اور ساتھ میں کوستا رہا کہ تو گھر میں سب سے بڑا ہے اگر تیری یہ حالت رہی تو باقی بہن بھائیوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا بے غیرت تیری چار بہنیں ہیں، ایک چھوٹا بھائی ہے، ماں بوڑھی ہو رہی ہے، میں مشین کندھے پر رکھ کر روزانہ مزدوری کرنے جاتا ہوں تمھیں کچھ احساس نہیں کہ ہم لوگ زندگی کس طرح گزار رہے ہیں۔ تو اپنے تایا کے بچوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا وہ ہم سے بہت آگے ہیں وہ مالی طور پر مستحکم ہیں وہ اگر سکول کالج میں نہ بھی پڑھیں گے تو اُن کا گزارا ہو جائے گا اُن کے باپ کے پاس پیسہ ہے باہر کی کمائی ہے، او بغیرتا میں تو ایک معمولی درزی ہوں دہاڑی کا 100 روپیہ بھی نہیں بنا سکتا۔

مگر کاظم میں کوئی تبدیلی واقعہ نہ ہوئی کاظم کے ماں باپ فوت ہو گئے اور اب کاظم اپنے بیٹے کو گالیاں دیتا اور کوستا ہے "تو جوان ہے کوئی کام کیوں نہیں کرتا گھر کا خرچہ کیسے چلے گا میں بوڑھا ہو گیا ہوں تمھیں شرم نہیں آتی میں ایک کلرک تھا تیرے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔" کاظم کی ان باتوں کے جواب میں اُس کا بیٹا اُسے مارتا ہے اور گندی گندی گالیاں بکتا ہے کاظم کے ماں باپ کو، اُس کی چار بہنوں اور اعظم کو جو کہ اپنے اپنے گھروں میں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کاظم کی گھریلو ضروریات کو بھی پورا کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کاظم، اعظم کے گھر آ کر روتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تو کبھی اپنے ماں باپ کو تنگ نہیں کیا تھا میں تو ہمیشہ اُن کی عزت کرتا تھا پتا نہیں میرے گھر میں ایسی اولاد کیوں پیدا ہو گئی نا جانے مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟ اور اعظم دل میں سوچتا ہے کہ بڑا بھائی کتنے جھوٹ بول رہا ہے۔۔۔۔۔۔

9 مرلے زمین

فون کی گھنٹی بجی، میں گہری نیند میں تھا اس لئے میں فون سُن نہ سکا، جب میں اُٹھا دوپہر 12 بجے کے بعد تو حسبِ معمول اپنا موبائل اُٹھایا، کھولا چیک کیا اُس میں ایک مس کال تھی اور واٹس ایپ پر ایک وائس میسج تھا۔ وائس میسج میرے بھتیجے کا تھا جو کہ مجھے بالکل پسند نہیں تھا مگر میری مجبوری تھی، کیونکہ میرا بڑا بھائی جنوری 2020ء میں COVID-19 کی نذر ہو چکا تھا۔
ہمارا جو آبائی گھر تھا اُس کو بیچنے کی سرگوشیاں سر اُٹھا رہی تھیں، اِس 9 مرلے کے گھر کے ہم آٹھ وارث تھے جن میں چار بہن بھائی ہم زندہ اور ایک بھائی جو وفات پا چکے تھے، اُن کے تین بچے اور ایک بیوہ۔ یہ باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں جب میں نے اپنے بھتیجے کا وائس میسج دیکھا پھر جب اُسے سُنا، وہ اپنے روایتی بدتمیزی کے انداز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا، نہ تم فون اُٹھا رہے ہو، مجھے جلدی سے بتاؤ مکان کب بکے گا میرا حصہ کب ملے گا؟ جب اُس کی یہ وائس ریکارڈنگ سُنی تو ایک لمحے کے لئے میرا خون کھول اُٹھا، جی چاہا کہ میں ابھی فون کر کے اِس کے ساتھ اُسی زبان میں بات کروں جس میں یہ مجھ سے بات کر رہا ہے مگر عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ چپ رہوں۔ پھر ایسے لگا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا نہیں حسن نہیں، ابھی نہیں ابھی تمھیں کچھ دن اور یہ برداشت کرنا پڑے گا کیونکہ مکان کا بیانہ ہو چکا تھا اور دو مہینے کا ٹائم فکس ہو چکا تھا، جس کے تحت ہم نے گھر کا قبضہ خریدنے والی پارٹی کو دینا تھا اور اُس پارٹی نے ہمیں باقی ماندہ رقم ادا کرنی تھی۔
میں نے وائس میسج کے ذریعے ہی پیغام بھیجا کہ ابھی کچھ کام رُکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے تھوڑا ٹائم لگے گا، ویسے بھی ہمارا جو معاہدہ ہوا ہے اُس کے مطابق ابھی تین ہفتے باقی ہیں اس لئے تھوڑا حوصلہ اور صبر رکھو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ والد کی وفات کے بعد میرا بھتیجا اس گھر میں اکیلا رہ رہا تھا، اس کی سوتیلی ماں اپنے میکے واپس جا چکی تھی، ایک بہن کی شادی ہو چکی ہے اور دوسری بہن کو بچپن ہی سے مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ اپنی حقیقی ماں کی وفات کے بعد اس کی دونوں

بہنوں کو میری بیوی اپنے گھر لے آئی، اِس دوران اس کی بڑی بہن اسراء کی شادی ہم نے اپنے کزن کے بیٹے کے ساتھ کردی جو کہ گجرات میں رہائش پذیر ہے جبکہ اسکی چھوٹی بہن 14 برس تک ہمارے ساتھ رہی ہمارے بچوں کی طرح۔ مگر جیسا کہ میں نے بتایا اُس کو مرگی کے دوڑے پڑتے ہیں۔ ایک دن اُس نے سوتیلی ماں کی وجہ سے چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی اُلٹے اُس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ پھر میں نے اور میری بیوی نے بڑے بھائی کو گھر بلایا اور کہا کہ آج کے بعد یہ ہمارے گھر میں نہیں رہے گی آپ اِس کا علاج کروائیں اُس کے اخراجات وغیرہ ہم برداشت کریں گے، آپ اپنے گھر میں رکھیں اپنی بیٹی کو کیونکہ یہ ہمارے لئے 302 کا چلتا پھرتا کیس ہے۔

میرا بھائی اُسے گھر لے جانا نہیں چاہتا تھا نہ ہی لڑکی کی سوتیلی ماں اسے پسند کرتی تھی، مگر میں نے اور میری بیوی نے یہ طے کر رکھا تھا کہ بہت ہو چکا اب ایسا نہیں ہوگا، چند مہینے کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی باپ نے اُسے اپنے گھر کے سٹور میں ایک چارپائی بچھا کر دیدی، اور کہا تم نے اِس بند سٹور میں رہنا ہے جس میں کوئی روشن دان تھا نہ کوئی کھڑکی بس سامان تھا اور ایک چارپائی کی جگہ تھی۔ یہ بچی کچھ تو بیماری کی وجہ سے اور کچھ اپنے باپ کے رویئے کی وجہ سے بہت زیادہ بدتمیز ہو چکی تھی کسی چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتی تھی کبھی باپ کو گالیاں دینا شروع کر دیتی کبھی کہتی سوتیلی ماں مجھ پر جادو اور تعویذ کرتی ہے اِس لئے میں ٹھیک نہیں ہوتی۔ میرا بھتیجا بھی اپنی چھوٹی بہن کو غصے میں آکر بہت زیادہ مارتا پیٹتا اِس قدر مارتا کہ وہ لہولہان ہو جاتی جو بھی کوئی اسے بچانے کی کوشش کرتا اُسے بھی مار پڑتی۔

یہ سلسلہ میرے بھائی کی وفات تک یونہی جاری رہا، میرے بھائی کو سرکاری ادارے سے ریٹائرڈ ہوئے تقریباً 16 برس ہو چکے تھے اُن کی پینشن بھی بہت کم تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر کے اخراجات احسن طریقے سے نہیں چلا سکتے تھے، اُوپر سے جوان بیٹا 28 برس کا ہو چکا تھا بڑی مشکل سے اس نے میٹرک پاس کیا تھا، سارا دن سویا رہتا شام پانچ بجے اُٹھتا پھر میرے بھائی اور اپنی سوتیلی ماں سے لڑائی جھگڑا کرنے لگتا۔ کبھی کبھی محلے کے لوگ بھی اکٹھے ہو جاتے یا کبھی کبھی میرا

بھائی خود اپنی جان بچانے کے لئے محلے داروں کو بلا لیتا کہ آئیں دیکھیں کہ میرا بیٹا مجھے مار رہا ہے کبھی باپ سے آٹھ ہزار روپیہ مانگتا، اور وہ ایک دو دن میں ختم کر کے پھر کہتا کہ مجھے تین چار ہزار روپیہ دو۔ باپ منتیں کرتا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں میری پینشن اتنی نہیں ہے، تم ہر مہینے زبردستی میری پینشن چھین لیتے ہو، گھر کے اخراجات چلانے کے لئے بھی میرے پاس پیسے نہیں رہتے، میری بہنیں اور میرا بھائی میری مدد کرتے ہیں۔ پھر یہی بیٹا اپنے باپ کی بہنوں اور بھائی کو گالیاں دینا شروع کر دیتا، باپ کو مار مار کر زخمی کر دیتا اور کہتا، جاؤ اپنی بہنوں اور بھائی سے خیرات لے کر آؤ مجھے نہیں پتا مجھے پیسے چاہییں اگر تم نے پیسے نہ دیئے تو میں تمھیں گولی مار دوں گا۔

میرا بھائی ہمیں فون کرتا کبھی ہمارے پاس آ جاتا کہ میری مدد کرو، ہم اُس کا فون سنتے کبھی نہ سنتے، جب وہ گھر آتا تو یقین جانیں دل نہیں کرتا تھا کہ اُس سے بات کروں، مجھے غصہ آتا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا کوئی بات کرنا چاہتا تو میں کہتا یار یہ چائے پی اور جا۔ میں نے کوئی بات نہیں کرنی جا یہاں سے۔ وہ خاموشی سے اُٹھتا اور چھوٹی بہن کے گھر چلا جاتا وہ بھی کافی لعن طعن کرتی پھر اُس کو ترس آ جاتا کچھ پیسے بھائی کی جیب میں ڈال دیتی اور کہتی مجھے پتا ہے کہ تیرے بیٹے نے یہ پیسے گھر جاتے ہی چھین لینے ہیں۔

اِسی کشمکش کے دوران میرا بڑا بھائی 24 جنوری 2020ء میں کورونا کا شکار ہوا اور اِس جہان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا، مگر اُس کے جانے کے بعد اُس کا بیٹا عذاب بن کر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا، اب وہ وقتاً فوقتاً مجھے فون کرتا کہ چاچو مجھے 5 ہزار روپے خرچے کے لئے چاہییں، کبھی میری بہنوں کو فون کرتا کہ پھوپھو میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ بڑے بھائی کے فوت ہوتے ہی اسکی دوسری بیوی اپنے بھائیوں کے ساتھ میکے چلی گئی، اور اس کی چھوٹی بیٹی راشدہ جس کو مرگی کے دوڑے پڑتے تھے اُس کو بڑی پھوپھو نے اپنے گھر رکھ لیا، اور ماجد بالکل اکیلا اُس 9 مرلے کے گھر میں جو کہ ہمارے باپ اور دادا کے نام تھا اور جسے بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ ہمارے باپ نے محکمہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے ایک لاکھ روپیہ قرضہ لے کر تعمیر کروایا تھا، کئی برس تک ہمارے والد قرضے کی قسطیں ادا کرتے رہیں ایک لاکھ روپے کے

قرضے کے بدلے ہمارے باپ نے محکمے کو 287000 ادا کیا، پھر جا کر ہمارے باپ کی کہیں جان چھوٹی ابھی یہ سستا دور تھا یہ 1976ء کی بات ہے۔

ہمارے والدین ہمیں اس دنیا میں چھوڑ کر چلے گئے ہم نے اپنے بڑے بھائی کو اپنے باپ کے گھر میں رہنے دیا اور کبھی نہیں سوچا کہ ہم نے اپنے باپ کا گھر بیچنا ہے، مگر جس دن میرا بھائی فوت ہوا اُسی دن سے ماجد نے کہنا شروع کر دیا چاچو گھر بیچو مجھے حصہ دو، اس کی سوتیلی ماں نے بھی یہی مطالبہ کیا۔ بالآخر میں نے ایک ڈیلر سے بات کی اور گھر کا سودا طے کر دیا، سودا طے کرنے میں بہت سی دشواریاں حائل ہوئیں کیونکہ ہمارے ملک کا نظام انتہائی کرپٹ ہے جائز کام کرنے کے لئے بھی رشوت دینا پڑتی ہے اُس کے بغیر آپ کا کوئی کام نہیں ہو سکتا وہ بھلے پٹوار خانہ ہو، تحصیل دار کا دفتر ہو، کچہری ہو یا مالیاتی ادارہ ہو۔ لوگ منہ مانگی رقم مانگتے ہیں کیونکہ اُنہیں پتا ہے کہ آپ پھنسے ہوئے ہیں، مجبور ہیں، آپ کی شنوائی نہیں ہونی۔ اگر آپ پٹواری کی شکایت تحصیل دار کے پاس لگانے جائیں گے تو وہ پہلے سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔

مجھے بھی ان سب تجربات سے گزرنا پڑا، میں نے زندگی میں کبھی رشوت دی تھی نہ لی تھی مگر مجھے اپنے باپ کے 9 مرلے کے مکان کے لئے مختلف اداروں محکموں میں چھ لاکھ روپے رشوت دینا پڑی، حالانکہ میں نے ایک وکیل صاحب بھی کر رکھے تھے، جن کی فیس میں نے ایک لاکھ روپیہ اپنی جیب سے ادا کی۔ خدا خدا کر کے 8 وارثوں کو ایک طے شدہ تاریخ پر اکٹھا کیا اور اُنھیں تحصیل ہیڈ کوارٹر لے گیا وہاں پر تحصیل دار کے سامنے بیان ہوئے اور مکان کی باقی ماندہ رقم پے آرڈر کی صورت میں وصول کی۔ تین چار دن کے بعد مجھے حصے داروں کے فون آنے لگ پڑے، ہاں جی ہمارا حصے کی رقم کب ملے گی، میرے لئے یہ بڑا تکلیف دہ امر تھا کیونکہ اُس گھر سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں میرے باپ کا گھر تھا، میری جوانی وہاں گزری تھی ہم بہن بھائی وہاں اکٹھے رہے تھے ماں باپ کے ساتھ، اُس گھر میں چھوٹے موٹے جھگڑے بھی ہوتے تھے، خوشیاں بھی ہوتی تھیں، عیدیں بھی وہاں گزاری تھیں، رمضان بھی وہاں گزارے تھے، مگر اب، وہ گھر ہمارا نہیں تھا وہ 9 مرلے زمین تھی جس کے 8 وارث تھے اور سب نے اپنا اپنا شرعی حصہ وصول کرنا تھا۔

ماجد کو سب سے زیادہ جلدی تھی وہ مجھے روز فون کر رہا تھا، اُس کا شرعی حصہ 1800000 روپے بنا مگر وہ بضد تھا کہ میں نے 3600000 لینا ہے کیونکہ گھر سے نکلنے کے بعد اس نے دو کمرے کا فلیٹ خریدنا تھا جس کی قیمت کوئی 24 یا 25 لاکھ روپے ہوگی باقی ماندہ رقم سے ایک گاڑی خریدنی تھی تاکہ Uber کے طور پر چلا سکے، فلیٹ کے لئے کچھ سامان بھی خریدنا تھا۔ 7 حصے داروں میں سے صرف ہم تین بہن بھائی یہ چاہتے تھے کہ اس کو حصے کے مطابق رقم ادا کردی جائے مگر چار حصے دار تھے اپنے حصے میں سے ماجد کو ایک روپیہ بھی دینا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے ماجد کو ایک دن اپنے گھر بلایا اور ساتھ میں وکیل صاحب اور اپنے ایک دوست کو بھی۔ ہم تینوں نے بیٹھ کو ماجد سے بات کی کہ بھائی اِس طرح تمھیں کوئی حصہ دینے کو تیار نہیں کیونکہ جس طرح کے تعلقات تمہارے اپنے باپ کے ساتھ تھے اور تم نے جو تکلیف اپنے باپ کو دی زندگی میں اُس کی گواہی پورا محلہ دیتا ہے۔ ہم سب بہن بھائی بھی یہ جانتے ہیں کہ تم کتنی بدتمیزی کے ساتھ اپنے باپ کے ساتھ پیش آتے تھے، لہٰذا ہمارے پاس یہ 1800000 روپیہ ہے جو تمھارا شرعی حق ہے، یہ تم لے سکتے ہو اِس کے علاوہ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں ہم جو کچھ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اپنے حصوں میں سے کردیں گے۔ مگر ماجد نے وہ 1800000 روپے لینے سے انکار کر دیا، اُس نے کہا نہیں مجھے پورے -/3600000 روپے دو وہ اُٹھ کر جانے لگا تو میرے دوست نے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھایا پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے کہا کہ چلو ایسا کرو جو اِس کی ایک بیمار بہن ہے اُس کا حصہ اِس کو دیدو جو کہ -/900000 بنتا ہے، باقی حسن تم 5 لاکھ ڈال دو اور چار لاکھ اپنی بہنوں کو کہو کہ اپنے حصے میں سے دیدیں تاکہ اِس کے -/3600000 پورے ہو جائیں۔ پھر یہی ہوا ہم نے پھر اٹھارہ اٹھارہ لاکھ کے دو چیک بنائے اور وکیل صاحب کے سامنے اس سے ریسو کروائے اور یہ طے کیا کہ آج کے بعد اِس کے ساتھ ہمارا کسی قسم کا کوئی لین دین نہیں ہوگا، نہ ہی ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق باقی رہے گا۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے پھر وہ دو چیک لے کر چلا گیا۔۔۔۔۔۔

PAIN

صبح سات بجے کا ٹائم تھا فون کی گھنٹی بجی بچے اُس وقت سکول کے لئے تیار ہو رہے تھے بڑی بیٹی کالج جانے کے لئے اپنے گاڑی کا انتظار کر رہی تھی اتنے میں ماں نے باورچی خانے سے آواز دی اوئے میرے علاوہ بھی کوئی ہے جو فون اٹینڈ کر لے۔ میں نے فون اُٹھا لیا دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی ایک نسوانی آواز آرہی تھی، آپا اماں جی کی طبیعت خراب ہے اور عزیز بھٹی ہسپتال والوں نے جواب دے دیا ہے وہ کہتے ہیں یا تو مریض کو آپ لاہور لے جائیں یا پھر اسلام آباد۔ آپا ہم اماں جی کو اسپیشل گاڑی کروا کر راولپنڈی لا رہے ہیں اور سیدھے بینظیر بھٹو ہسپتال میں اُن کے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے آپ بھی وہیں آجانا اور فون کٹ گیا۔ میں نے فون رکھا اور اپنی بیگم کو آواز دی، ادھر آؤ بات سنو رانی، اُس نے کہا کیوں خیر ہے کیا ہوا کس کا فون تھا؟ میں نے کہا کہ تیری بہن کا فون تھا اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انھیں یہاں راولپنڈی لایا جا رہا ہے وہ سیدھے ہی ہسپتال جائیں گے ابھی وہ لوگ سوہاوہ کے قریب پہنچے ہیں گھنٹہ ڈیڑھ اور لگے گا۔

رانی پریشان ہوگئی کیونکہ اماں جی کو چند ماہ پہلے ڈاکٹروں نے ہیپاٹائٹس سی ڈائیگنوز کیا تھا بینظیر بھٹو ہسپتال راولپنڈی میں ایسے مریضوں کے لئے ایک سپیشل وارڈ بنائی گئی ہے جس میں کہ 20 مریضوں کو وارڈ میں رکھا جا سکتا ہے اور اس کا تمام خرچہ ایک مخیر صاحب کے ذمے ہے جو کہ خود بھی ڈاکٹر ہیں اور ماہر جگر و معدہ ہیں، اُن کا بڑا نام ہے اس بیماری کے حوالے سے۔ ہم لوگوں نے بھی تقریباً دس دن پہلے اماں جی کو انہی ڈاکٹر صاحب کے پرائیویٹ کلینک میں جو کہ ہمارے گھر کے قریب ہی ہے دکھایا تھا۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب نے بائیوپسی کی تھی اور کہا تھا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے انشاء اللہ بیماری میں فرق پڑے گا۔ انھوں نے اپنے پرائیویٹ کلینک میں جو فیس مانگی وہ ہم نے دے دی بائیوپسی کے دس ہزار لئے ایک رات اپنے پرائیویٹ کلینک میں ایڈمٹ رکھا اُس کے چارجز اس کے علاوہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے کلینک کا نام "Pain" رکھا ہوا تھا وہاں پر طرح طرح کے مریض دور دراز علاقوں سے چیک اپ کرانے کے لئے آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس دیکھنے کا ٹائم نہیں ہوتا

تھا مریض دو دو مہینے ایڈوانس اپنی اپنی Appointments لیا کرتے تھے ہم نے بھی جب پہلی دفعہ اُن کے کلینک فون کیا تو جواب ملا دو مہینے بعد کی Appointment مل سکتی ہے تو میں نے فون پر غصے میں آ کر پی اے سے کہا کہ مریض درد سے آج مر رہا ہے اور آپ دو مہینے بعد کا ٹائم دے رہے ہو کیا یہ انسانیت ہے؟

میں نے غصے میں فون بند کر دیا مگر رانی جو میری بیوی ہے اُس کا اصرار تھا کہ اماں جی کو اسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے، اماں جی ٹھیک ہو جائیں گی اس کا بڑا نام ہے اس کے ہاتھ میں شفاء ہے ہم پرائیویٹ دکھا دیں گے ہم پیسے دے دیں گے زیادہ، آپ اپنے تعلقات استعمال کریں اور کسی طرح اماں جی کیلئے ٹائم لے لیں پھر میں نے تھک ہار کے نا چاہتے ہوئے اپنے ایک محلے دار ڈاکٹر سے فون پر بات کی جو کہ بینظیر ہسپتال میں ان ڈاکٹر صاحب کا جونیئر تھا۔ میں نے اُس سے کہا احمد یار! اماں جی بیمار ہیں اور ڈاکٹر صاحب ٹائم نہیں دے رہے اُن کو جگر کا مسئلہ ہے پلیز یار تم ذرا ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے ٹائم لے دو۔ اُس نے کہا اچھا بھئی میں کوشش کرتا ہوں وعدہ نہیں کرتا آپ فون رکھیں میں تھوڑی دیر بعد آپ سے بات کرتا ہوں۔ پھر احمد نے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد فون کیا اور کہا آپ اماں جی کو شام پانچ بجے پرائیویٹ کلینک لے آیئے گا۔ اُس دن کے بعد دس دن ہو چکے تھے اماں جی دوائیاں لے کر گاؤں جا چکی تھیں کہ اچانک آج صبح سات بجے یہ خبر ملی کہ اماں جی کو دوبارہ راولپنڈی بینظیر ہسپتال میں لایا جا رہا ہے۔

یہ لوگ تقریباً نو بجے تک بینظیر ہسپتال اُس جگر اور معدے کے اسپیشل وارڈ میں پہنچ چکے تھے جہاں جونیئر ڈاکٹرز اماں جی کا طبی معائنہ کر رہے تھے اور آن کال میڈیکل سپیشلسٹ کو بھی بلا لیا گیا تھا اماں جی کا درد سے برا حال تھا وہ بار بار کہتی تھیں کہ میری چھاتی پر بوجھ ہے مجھے کوئی دوائی دو مجھے آرام نہیں ہے۔ ہم سب بڑی بے بسی سے اماں جی کو دلاسے دے رہے تھے اماں جی آپ ٹھیک ہو جائیں گی ابھی ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں وہ آپ کو دوائی دیں گے آپ پریشان نہ ہوں۔ مگر اماں جی کی تکلیف اتنی شدید تھی کہ میرے جیسے سخت دل انسان کی آنکھوں میں بھی ستارے ٹمٹمانے لگ پڑے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک بیٹی گاؤں سے آئی تھی اور دوسری بیٹی کا میاں جو کہ میرا

ہم زلف تھاوہ آئے تھے۔اماں جی کے دونوں بیٹے ملک سے باہر تھےایک عرب ملک میں اوردوسرا انگلینڈ میں تھا اُن کو جب فون پر اماں جی کی حالت بتائی گئی تو ایک نے کہا جو کہ بڑا تھا کہ یار میرے پاس تو مالی طور پر اتنے پیسے نہیں کہ فوری طور پر پاکستان آسکوں یا کچھ پیسے بھیج سکوں میں چھوٹے سے بات کرتا ہوں باقی یہ کہ مجھے اماں جی کی طبیعت کے بارے میں مسلسل بتاتے رہنا مجھے بہت فکر ہو رہی ہے۔ چھوٹے بیٹے سے جب بات کی گئی تو اُس نے کہا کہ بھائی صاحب میں نے آپ تین جو ہمارے داماد ہیں، آپ تینوں کے اکاؤنٹس میں علیٰحدہ علیحدہ ایک ایک لاکھ روپیہ بجھوا دیا ہے۔ پیسے کی آپ لوگ فکر نہ کیجئے گا مگر اماں جی کا علاج بہترین ہونا چاہیے اُس میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔

ابھی یہ باتیں چل ہی رہیں تھیں کہ سینئر ڈاکٹر صاحب آ گئے انھوں نے ہمیں فوری طور پر 4 بوتلیں B پازیٹو بلڈ گروپ کا انتظام کرنے کو کہا اور ساتھ میں کہا فوری طور پر ہسپتال کے بلڈ بینک جائیں وہاں پتا کرلیں شاید ایک دو بوتلیں وہ فوری طور پر دے دیں۔ میں اور رانی بھاگتے ہوئے بلڈ بینک گئے جو کہ چار نمبر وارڈ سے تھوڑا قریب ہی تھا، ہم نے بلڈ بینک کے انچارج سے درخواست کی کہ مریض جگر اور معدہ کی وارڈ میں داخل ہے فوری طور پر خون کی ضرورت ہے۔ بلڈ بینک کے انچارج نے بڑی کمینگی کے ساتھ رانی کی شکل دیکھی اور بڑی ہوس زدہ نگاہوں سے مسکراتے ہوئے کہا، جی جی کیوں نہیں آپ کو تو ہم خون ضرور دیں گے۔ اُس کا یہ جملہ مجھے کاری ضرب محسوس ہوا مگر میں مجبور تھا کچھ کہہ نہ سکا، ضبط کر گیا۔ بلڈ بینک کے انچارج نے ہمیں فوری طور پر دو بوتلیں خون دے دیا اور وعدہ لیا کہ اس کے بدلے میں ہم اپنے عزیزوں سے دو بوتلیں خون کسی بھی گروپ کی ہوں بلڈ بینک میں جمع کروائیں گے ہم نے فوری طور پر حامی بھرلی اور بلڈ لے کر وارڈ میں آ گئے۔

وارڈ میں جب آئے تو اماں جی کو خون کی اُلٹیاں شروع ہو چکی تھیں اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں وہ بار بار یہی کہہ رہی تھیں مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے ڈاکٹر کریمی کے پاس گاؤں لے جاتے میں وہاں سے ٹیکہ لگواتی میرا درد ٹھیک ہو جاتا۔ اماں جی کو یہ نہیں پتا تھا کہ اُن کا جگر سکڑنا شروع ہو چکا ہے سینئر ڈاکٹر نے بلڈ کی بوتلیں لگوا کر ہمیں کہا کہ آپ شام کو دوبارہ اِن کو میرے

پرائیویٹ کلینک لے آیئے گا ان کی بینڈ ایج کروں گا اور انشاءاللہ وہ بینڈ ایج دو تین سال تک چل جائے گی۔ ہم نے بڑی مشکور نظروں سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ شام کو کلینک حاضری ہو جائیں گے۔

آج 13 برس ہو گئے ہیں اس واقعے کو، اماں کی آج چودھویں برسی ہے میں جب بھی اس کلینک کے پاس سے گزرتا ہوں تو میرے جگر میں PAIN شروع ہو جاتی ہے میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ انسان کتنا بے بس ہے، وہ ماں جو اپنے بچوں کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے مگر جب اس پر کوئی مصیبت یا بیماری پڑتی ہے تو بچے خاص طور پر بیٹے اور بہوئیں ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ مالی طور پر تو وہ ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں مگر جانی طور پر اپنی بیویوں کو والدین کے پاس خدمت کرنے کے لئے نہیں رکھتے نہ ہی اُن کی بیویاں چاہتی ہیں کہ وہ اپنی ساس اور سسر کی خدمت کریں۔ بلکہ یہ کہتی ہیں کہ ماؤں کی بہتر دیکھ بھال بیٹیاں ہی کر سکتی ہیں یہی حال اماں جی کے ساتھ ہوا۔ جب 13 برس پہلے اماں جی کی وفات ہوئی تو یہی سردیوں کے دن تھے جنوری کا مہینہ تھا اور دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی فوتگی کے وقت اماں جی کے پاس نہیں تھا۔ انسانی رویوں اور رشتوں میں اتنا فرق کیوں پڑ گیا ہے؟ ہم لوگ کیوں اتنے خود غرض ہو چکے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ پیسے سے سب کو خوش رکھ سکتے ہیں۔ کبھی کبھی میں یہ سوچ کر انتہائی خوف زدہ ہو جاتا ہوں اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی، یہ رویئے میرے اندر بھی پائے جاتے ہیں میں بھی جب کسی کے مرنے کی خبر سُنتا ہوں تو جنازے پر جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا بھلے وہ کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ میں یہ دُعا کرتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہی ہو، کبھی اپنے بیٹے کو بھیج دیتا ہوں یا کبھی اپنی بیوی کو۔ آج بھی مجھے میری بیوی نے ہی یاد دلایا کہ اماں جی کو فوت ہوئے تیرہ برس ہو چکے ہیں جب میں تیرہ برس پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو میرے اندر شرمندگی اور ندامت کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی ہے جانے کس پل کس لمحے موت کا فرشتہ میرا ٹوکن لے کر آ جائے ۔۔۔۔ اتنے میں رانی کھانے کا سامان ٹرے میں رکھ کر لے آئی اور کہنے لگی کہ فاتحہ کر لیں ۔۔۔

پُر فریب

شو بز کی دُنیا میں گو کہ میں کوئی بہت جانی پہچانی شخصیت نہیں ہوں، مگر پھر بھی مجھے اس دُنیا کے لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھوڑا بہت کام کرتے 35 برس کا عرصہ بیت چکا ہے، صحت نے اجازت دی تو شاید چند برس اور مل جائیں گے ۔ اس پُر فریب اور خود غرض دُنیا میں، میں نے 35 برسوں میں شو بز کے بڑے بڑے نام جن کا طوطی بولتا تھا اور جن کے بغیر فلم سٹوڈیوز، ٹی وی چینلز، تھیٹرز اور ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز خود کو نامکمل تصور کرتے تھے کیساتھ وقت گزارا۔ اب بات نکلی ہے تو تھوڑی دور تلک جائے گی، مجھے اچھی طرح یاد ہے ''ایک حقیقت ایک فسانہ'' پی ٹی وی کا بہت مشہور سیریل تھا اس میں دو مرکزی کردار تھے، ایک رپورٹر اور ایک ایڈیٹر کا ،اس ڈرامے کا مرکزی خیال ریاض بٹالوی کی روز نامہ ''مشرق'' میں لکھی گئی کہانیوں سے ماخوذ تھا ۔اس میں ایڈیٹر کا جو کردار تھا، وہ نثار قادری ادا کر رہے تھے، نثار قادری وہ فنکار جو راولپنڈی میں ٹیکسی چلایا کرتا تھا ایک دن ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر اُن کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھے جب اُنھوں نے نثار قادری کو کہا کہ راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن جانا ہے کتنے پیسے لو گے؟ نثار قادری اپنی بیسدار آواز میں بولے تو ریڈیو پروڈیوسر چونک گئے ۔ انھوں نے کہا میاں یہ تمھاری اپنی آواز ہے یا بنا کر بول رہے ہو؟ نثار قادری نے کہا، جناب یہ میری اپنی آواز ہے۔ اُنھوں نے پوچھا، ریڈیو میں میں کام کرو گے؟ نثار قادری مسکرائے اور پھر ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں صدا کار بن گئے ۔ مختلف ریڈیو ڈرامے کئے پھر لاہور ٹیلی وژن، کراچی اور کوئٹہ سے ہوتے ہوئے واپس لاہور ٹیلی وژن پر آگئے ۔ اُن کا ایک یادگار کردار جس کا میں آپ سے ذکر کر رہا ہوں وہ تھا ''ایک حقیقت ایک فسانہ''

میں، جس میں وہ اکثر کہا کرتے تھے ''ماچس ہوگی آپ کے پاس'' اِس کے علاوہ بھی اُنھوں نے بے شمار یادگار کردار ادا کیئے۔ پی ٹی وی کے تمام اسٹیشنز پر انھوں نے کام کیا، مگر آج کے دور میں کسی نئے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے اگر پوچھو کہ نثار قادری کو جانتے ہو؟ تو وہ انکار کردے گا۔ اسی طرح کا ایک بہت بڑا نام سجاد کشور کا ہے، جو کہ بنیادی طور پر صحافی تھے مگر پی ٹی وی راولپنڈی سے اُنھوں نے اپنی اداکاری کا آغاز کیا، مجھے جواُن کا سب سے پہلا ڈرامہ یاد ہے جو میں نے بڑے شوق سے دیکھا وہ تھا ''قربتیں اور فاصلے'' آج وہ اڈیالہ روڈ پر اپنے گھر میں کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ آپ دور کیوں جاتے ہیں افضال احمد کو دیکھ لیجئے، کتنا بڑا نام ہے ریڈیو، فلم اور تھیٹر کا آج گمنامی کی زندگی میں گم ہیں۔ جو سب سے بڑا دھچکا مجھے آج لگا، وہ لگا سٹیج اور ٹی وی کی بڑی اداکارہ رومانہ کے حوالے سے، خوبصورت آنکھوں اور دلکش مسکراہٹ والی گلابی سی یہ لڑکی جو پڑھی لکھی نہیں تھی جس نے لاہور تھیٹر پر راج کیا تھا۔ کبھی اس کے نام سے ٹکٹ بکتے تھے، ایک غیر ملکی نے جب اس کا ڈرامہ دیکھا تو اُس نے اِسے پاکستانی ''لوسی'' کا نام دیا وہ گاتی بھی بہت اچھا تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ اداکارہ رومانہ جس نے کہ ٹی وی پر بھی بے شمار مزاحیہ پروگرام کیئے اپنی اداکاری کا لوہا منوایا، کسی کو نہیں پتا کہ یہ فنکارہ لاہور کی سڑکوں پر بھیگ مانگتی رہی اور انتہائی غربت کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ اللہ کسی پر ایسا وقت نہ لائے، رومانہ ہنسانے والی واحد کامیڈین کوئن تھی جو سٹیج پر آتے ہی چھا گئی۔

ابھی کچھ دن پہلے میں جناب امجد اسلام امجد سے ٹیلی فون پر بات کررہا تھا تو باتوں باتوں میں مجھے پی ٹی وی کا ڈرامہ ''یا نصیب کلینک'' یاد آگیا جو کہ امجد اسلام امجد صاحب نے تحریر کیا تھا۔ اس ڈرامے میں سلیم ناصر جیسے بڑے فنکار کی موجودگی کے باوجود رومانہ پوری طرح چھائی رہی۔ میں نے ہنستے ہوئے امجد اسلام امجد سے کہا کہ ''آپ کے کمرے میں ہرے رنگ کی چادر ہے؟'' تو امجد اسلام امجد نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگے ''امین تمھیں یاد ہے یہ ڈرامہ؟'' میں نے کہا، جی سر اچھی طرح سے یاد ہے کیونکہ اس میں رومانہ نے ایک نرس کا کردار ادا کیا تھا، اور وہ جب بھی کسی مریض کے کمرے میں داخل ہوتی تو یہ سوال ضرور کرتی کہ ''آپ کے کمرے میں ہرے رنگ کی چادر ہے

؟'' پھر میں اور امجد اسلام امجد رومانہ کی زندگی کے بارے میں بات کرنے لگ پڑے اور بڑے دُکھی ہو گئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہت سی سٹیج اداکاراؤں نے رومانہ کا سٹائل اپنایا اُس کو فالو کیا، رومانہ کے چند قریبی دوست اُس کی زندگی کے بارے میں جب بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ رومانہ اپنے حالات کی خود ذمہ دار تھی نشہ کرتی تھی۔ لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ نشے کی طرف کیوں آئی؟ اُس کی سب سے بڑی وجہ عشق میں ناکامی تھی جو کہ اُس نے علی اعجاز کے ساتھ کیا تھا۔ علی اعجاز نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی ضرور کرے گا مگر علی اعجاز نے وعدہ خلافی کی اور ایک دن چپکے سے جا کر سیالکوٹ میں شادی کر لی، شادی والے دن ہی یہ خبر رومانہ تک پہنچ چکی تھی، بس اس دن کے بعد سے رومانہ اندر سے ٹوٹ گئی اور نشہ آور ادویات کا استعمال شروع کر دیا۔ انجکشن تک آ گئی، بیچ میں کچھ عرصے کے لئے خود کو ٹھیک اور مصروف بھی کر لیا، پھر سید نور صاحب اس کی زندگی میں آ گئے۔ فلمی صنعت اُن دنوں زوال کا شکار تھی صرف اسٹیج پر کام ہو رہا تھا بیک وقت سٹیج پر کئی ڈرامے ہو رہے ہوتے تھے۔ رومانہ کو دیکھتے ہوئے ''میڈیم باوری'' لکھا جو سپر ہٹ ثابت ہوا پھر نور صاحب بھی رومانہ کو نشے کے سہارے چھوڑ گئے۔

رومانہ نے اپنے آپ سے جنگ شروع کر دی، آخر ایک دن رومانہ ہار گئی اور نشہ جیت گیا، لیکن آپ اسے قدرت کا انتقام کہیں یا کچھ اور کہ جس جس نے رومانہ کو اس حال تک پہنچایا اُس کا اپنا حال بھی بہت دردناک ہوا۔ علی اعجاز اپنے آخری دنوں میں کس طرح رسوا ہوئے، گھر بار بیوی بچے ہوتے ہوئے بھی در در بھٹکے جو لوگ علی اعجاز کے ساتھ کام کر چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ نہایت کنجوس تھے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ہی سگریٹ نکالتے تھے تا کہ کوئی اور نہ مانگ لے۔ رومانہ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں فلموں کا بھی رُخ کیا مگر نشہ اُس کی رگوں میں اتنا اتر چکا تھا کہ آخر کار وہ سڑکوں پر رُلتی رُلاتی دُنیا سے چلی گئی۔

اِن تمام فنکاروں کا جو ذکر میں نے آپ سے کیا ہے اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ رنگین روشنیوں کی دُنیا جسے ہم فلم، تھیٹر، ٹی وی اور ریڈیو کہتے ہیں یہ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے، جب تک آپ کا نام

بکتا ہے ڈائریکٹر، پروڈیوسر آپ کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں مگر جب آپ ناکامی کا شکار ہوتے ہیں تو پھر یہ لوگ بڑی آہستگی کے ساتھ آپ سے دور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو کبھی اپنے دفتر میں آپ کو اپنی کرسی پر بٹھانا قابل عزت سمجھا کرتے ہیں جب ناکامی آپ کا مقدر بن جائے تو اپنے دفتر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

آج کے دور میں بھی جتنے نئے فنکار اس وقت عروج پر ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی شہرت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوگا تو وہ بہت بڑے دھوکے میں ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ اپنے سینیئرز کا احترام کریں، جونیئرز سے درخواست ہے کہ زندگی شو ہے تین گھنٹے کا، پہلا گھنٹہ بچپن کا، دوسرا جوانی کا اور تیسرا بڑھاپا ہے یہ یاد رکھو کہ ایک نہ ایک دن شہرت کا سورج غروب ہوگا۔۔۔

رقیب

وہ پانچ بہنوں میں سب سے بڑی تھی، قبول صورت پتلے نین نقش، دیکھنے میں دھیمے لہجے والی، گھر میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے تھوڑا باجیوں والا سٹائل تھا۔ وہ اپنے باپ کی دوسری بیوی میں سے تھی، اُس کا والد ریلوے میں گارڈ تھا، وہ ریلوے کالونی میں ایک کوارٹر میں رہتے تھے اُس کی پہلی ماں میں سے چار جوان سوتیلے بھائی تھے۔ محمد حسین نے اپنی پہلی بیوی اور چار بیٹے ہونے کے باوجود اس کی ماں صبیحہ سے دوسری شادی کر لی جو کہ محمد حسین کی عمر سے دُگنی چھوٹی تھی۔ یہ رشتہ کروانے میں صبیحہ کی ماں اور ریلوے کالونی کے کوارٹروں کا بڑا عمل دخل تھا کیونکہ صبیحہ کا باپ بھی ریلوے میں کام کرتا تھا، وہ دیگر ملازمین کے ساتھ گاڑی اسٹیشن سے چھوٹنے سے پہلے ٹرین کے ڈبے چیک کرتے اُن کے اندر لگے پنکھے الیکٹرک کنیکشن، واش روم، انجن کی ضروری دیکھ بھال کرتے اور اُسے سفر کے لئے OK کا سرٹیفیکیٹ جاری کرتے۔

محمد حسین اُنھیں دنوں میں مجید صاحب کا دوست بن گیا کیونکہ مجید صاحب گاڑیوں کی چیکنگ اور اُن کی دیکھ بھال کے انچارج تھے اکثر اسٹیشن پر اُن کی ڈیوٹی لگا کرتی اور محمد حسین جو کہ گارڈ تھا، وہ اکثر گارڈ کے کیبن میں آ کر بیٹھا کرتے اور کبھی کبھی اپنے چند دوستوں یا رشتہ داروں کو فری کراچی یا لاہور پہنچانے کے لئے محمد حسین گارڈ کے کیبن میں بٹھا دیا کرتے تھے، محمد حسین اُنھیں خوشی خوشی اپنے ساتھ لے جایا کرتا۔ محمد حسین اور مجید صاحب کی دوستی آہستہ آہستہ رشتہ داری میں بدل گئی محمد حسین کا کوارٹر ریلوے کالونی میں مجید صاحب کے کوارٹر کے بالکل ساتھ تھا، وہیں پر محمد حسین نے صبیحہ کو پہلی دفعہ دیکھا، صبیحہ اپنی جوانی اور خوبصورتی کی لہر میں زندگی گزار رہی تھی اُس کے اندر کا الہڑپن اُس کے بدن اور چہرے سے ٹھاٹھے مار رہا تھا۔

اُس کے حسن کے سامنے محمد حسین جو کہ عمر میں صبیحہ سے 20 یا 22 برس بڑا تھا اپنا دل ہار بیٹھا، صبیحہ اپنی خوبصورتی اور نوجوانی کے نشے میں اُن ریلوے کالونی کے کوارٹروں کی گلیوں میں محمد حسین کو اپنا

ہیرو بنا بیٹھی۔ ہمسایہ ہونے کی صورت میں جب محمد حسین کی ڈیوٹی نہ ہوتی تو صبیحہ کی ماں کوئی اچھا سا سالن ترکاری بنا کر صبیحہ کے ہاتھوں محمد حسین کے کوارٹر میں بھجوا دیتی، محمد حسین جب دروازہ کھولتا اور صبیحہ شرماتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے محمد حسین کو ترکاری دیتی اور کہتی کہ امی جی نے بھیجی ہے۔
محمد حسین جو کہ ایک میچیور آدمی تھا پہلے سے شادی شدہ تھا، وہ صبیحہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے اندر سمو لیتا کبھی کبھی ترکاری کی پلیٹ پکڑتے ہوئے وہ صبیحہ کی انگلیوں کو دبا دیتا، تو صبیحہ کے پورے بدن میں سرسراہٹ سی دوڑ جاتی، وہ جلدی سے اپنے گھر بھاگ جاتی اور کافی دیر تک اُس کا دل دھک دھک کرتا رہتا۔ اُس کی ماں صبیحہ کا چہرہ پڑھ لیتی، پھر ایک دن محمد حسین نے اپنی ڈیوٹی کے دوران ریلوے اسٹیشن پر مجید صاحب سے صبیحہ کا ہاتھ مانگ لیا، مجید صاحب جو چھ بیٹیوں کے باپ تھے اور تین بیٹے جو کہ بہنوں سے چھوٹے تھے، اُن کے لئے یہ بہت بڑی خوشخبری اور سکون کی علامت تھی کہ ایک 16 گریڈ کے آفیسر نے اُن کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا۔
مجید صاحب کو پہلے سے ہی اُن کی بیگم نے بتا دیا ہوا تھا کہ محمد حسین صبیحہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے، اِس لئے مجید صاحب کو کچھ زیادہ حیرانگی نہ ہوئی جب محمد حسین نے صبیحہ کا ہاتھ مانگا تو اُنھوں نے کہا ٹھیک ہے، آپ اگلے ہفتے چند بندے لے کر میرے گھر آجائیں اور نکاح کر کے صبیحہ کو باعزت طور پر اپنے ساتھ لے جائیں۔ پھر اگلے جمعہ یہی کچھ ہوا محمد حسین اپنے چند دوستوں کے ہمراہ آیا اس بارات میں دو جوان لڑکے جو کہ صبیحہ کی عمر کے تھے، وہ محمد حسین کے بیٹے یعنی پہلی بیوی سے تھے اقبال اور جاوید، اِن دونوں نے بھی اپنے باپ کی دوسری شادی میں شرکت کی۔
صبیحہ ہنسی خوشی محمد حسین کے ساتھ رہنے لگ پڑی، میں نے پہلی دفعہ صبیحہ اور اُس کی پانچ بیٹیوں کو اپنے محلے میں صبیحہ کے بھائی کے گھر میں دیکھا تھا، محمد حسین ریلوے سے ریٹائرڈ ہو گیا تھا اور اُس کے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، لہٰذا اُس کے بڑے سالے نے اپنی بہن کو اُس کے بچوں سمیت اپنے دو کمرے کے گھر میں رہنے کی جگہ دے دی، جس پر عارف کی بیوی جو کہ صبیحہ کی بھابھی تھی، اُسے یہ بات پسند نہ تھی۔ صبیحہ نے کہا ہم جلد ہی یہاں سے کہیں اور کرائے پر چلے جائیں گے، مگر اُن کا جلدی جانا بھی عارف کے گھر سے تین برس میں مکمل ہوا، وہ بھی میری وجہ سے

صبیحہ کی بڑی بیٹی روبینہ جیسا کہ میں نے بتایا بڑی خاموش اور سلیقہ مند تھی، میری اور اُس کی دوستی ہوگئی، وہ ہمارے محلے کے پرائیویٹ سکول میں پڑھایا کرتی تھی اور روزانہ میرے گھر کے گیٹ کے قریب سے گزرتی تھی۔ پہلے پہل میں اُسے گیٹ کے باہر کھڑا ہو کر دیکھتا تھا آہستہ آہستہ یہ میری روٹین بن گئی، صبح سات بج کر پچپن منٹ پر وہ گھر سے نکلتی اور میں سات بج کر پچاس منٹ پر اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑا اُس کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھتا۔ میرے اندر جو عشق کی لہر تھی اُس کا اثر روبینہ کے چلتے قدموں، جھکی نگاہوں اور سرخ ہوتے چہرے سے محسوس ہوتا۔ پھر سکول کی چھٹی تک میں اس نشے میں رہتا دوپہر کے ایک بج کر پینتیس منٹ پر وہ سکول سے نکلتی اکثر اُس کے ساتھ ایک اور اُستانی بھی ہمراہ ہوتی میں ایک بج کر تیس منٹ پر اپنے دروازے پر اُس کو جاتے ہوئے دیکھتا جب تک کہ وہ اپنے گھر میں داخل نہ ہو جاتی۔

روبینہ پانچ بہنوں میں سب سے بڑی تھی ایک بھائی سب سے چھوٹا تھا، میں نے ایک دن ہمت کر کے روبینہ کو سکول جاتے ہوئے آواز دی مگر وہ رکی نہیں، میں نے اُسے کہا کہ میں نے تم سے بات کرنی ہے مگر وہ میری بات ان سُنی کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے سکول کی طرف چلی گئی۔

میری والدہ کا روبینہ کے ماموں عارف اور اُس کی بیوی کے ساتھ پہلے سے ملن جلنا تھا محلے داری تھی وہ ایک دوسرے کی غمی خوشی میں شریک ہوا کرتے تھے۔

میں اُن دنوں بی اے کا طالبعلم تھا، اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا، میری ماں آئی اور کہا، عابد بیٹا آج شب برأت کا دن ہے، یہ حلوہ اور پوریاں میں نے بنائی ہیں محلے کے دو تین گھروں میں دے آؤ، پہلے خان صاحب کے گھر جانا پھر رب نواز جو کہ نسرین کا گھر ہے اُس کے گھر یہ پوریاں اور حلوہ دینا، اور ہاں یہ ایک پلیٹ عارف کے گھر بھی دے دینا۔ یہ بات سُننی تھی کہ میں مچل گیا جلدی سے ٹرے اُٹھایا اور پہلے خان صاحب کے گھر گیا، اُن کے گھر بیل دی وہاں سے اُن کا بیٹا حمید اللہ نکلا، میں نے اُسے حلوہ پوریاں دے دیں۔ پھر رب نواز کے گھر گے تو نسرین باجی باہر آئیں وہ مجھ سے کہنے لگیں، عابد تو کدھر بڑے دن کے بعد تجھے دیکھا ہے۔ میں نے کہا جی یہ امی نے شب برأت کے ختم کا حلوہ پوری بھیجا ہے۔ پھر میں جلدی سے عارف صاحب کے گھر چلا گیا

گھنٹی بجائی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر کوئی نہ باہر نکلا، میں نے پھر تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجائی تو چند لمحوں کے بعد گیٹ کھلا تھوڑا سا اور ایک باریک سی نسوانی آواز میرے کانوں میں آئی ۔۔۔کون ۔۔۔؟میں نے کہا، جی عارف صاحب گھر پر ہیں؟ اُنھوں نے کہا، وہ تو نہیں ہیں نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، جی میں چوہدری صاحب کے گھر سے آیا ہوں، عابد میرا نام ہے میری والدہ نے یہ حلوہ پوری شب برأت کے سلسلے میں بھجوائی ہے۔ ایک چوڑیوں سے بھرا ہاتھ باہر نکلا جس کی ہتھیلی پر گول دائرے میں مہندی لگی ہوئی تھی، میں نے وہ پلیٹ پکڑاتے ہوئے اُن ہاتھوں کو زور سے دبایا کیونکہ وہ ہاتھ مس روبینہ کے تھے۔

جب میں واپس لوٹنے لگا تو اُس نے کہا، پلیٹیں لے جایئے۔ میں کھڑا ہو گیا، پھر وہی دو حنائی ہاتھ باہر نکلے اور اُن ہاتھوں نے دھلی ہوئی پلیٹیں میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں نے ایک دفعہ پھر اپنے محبوب کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا، مجھے ایسا لگا جیسے میں نے دُنیا میں سب کچھ پا لیا ہے۔ میرے احساسات کو روبینہ نے بھی محسوس کیا، اتنے میں اندر سے آواز آئی بینہ کون ہے بیٹا؟ یہ عارف صاحب کی بیگم کی آواز تھی، بینہ نے کہا، ممانی جان یہ کوئی چوہدری صاحب کے گھر سے حلوہ پوری کی نیاز آئی ہے۔ عارف صاحب کی بیگم ساجدہ نے کہا، چلو بیٹا اس کو باورچی خانے میں رکھ دو۔ پھر آہستہ آہستہ، میرے اور روبینہ کے تعلقات بڑھنے شروع ہو گئے، روبینہ کی سب سے چھوٹی بہن پنکی سات آٹھ برس کی تھی، میں اُسے ٹافیاں لے کر دیتا، کبھی چپس لے کر دیتا، اور اُس کو ایک رُقعہ بھی دیتا اور کہتا، پنکی یہ باجی کو دینا یہ سوال ہے جسکا جواب مجھے نہیں آتا اُنھیں کہنا کہ مجھے یہ سوال حل کر کے دے دیں۔ اُسی کاغذ کے دوسری طرف اگلے دن مجھے جواب مل جاتا۔

اِس طرح چھ سات ماہ گزر گئے ہم دونوں کی دوستی اور خط و خطابت بڑھتی چلی گئی، اُن دنوں نہ موبائل ہوا کرتے تھے نہ ہی پی ٹی سی ایل ٹیلی فون اس لئے ہمیں چھوٹے بچوں کا سہارا لینا پڑتا تھا عید کے دنوں میں، میں نے صدر سے جا کر ایک آرٹیفیشل انگوٹھی خریدی پھر اُس کو پیکٹ میں بند کر کے پنکی کے ہاتھ روبینہ کو بھیج دیا۔ روبینہ نے عیدی کے طور پر مجھے ڈاک کے ذریعے ایک ریڈی میڈ سوٹ پارسل کیا جو کہ میرے گھر کے پتے پر آیا۔ ماں نے پوچھا، عابد یہ کہاں سے آیا ہے پتر؟

میں نے کہا، ماں جی یہ میرے دوست ناصر نے لاہور سے بھیجا ہے۔ ابھی ہمارے پیار اور عشق کی کہانی چل رہی تھی کہ ایک دن جب میں نے پنکی کو روبینہ کے لئے خط دیا تو پنکی کا والد محمد حسین ایک دم گیٹ سے باہر آ گیا اُس نے آ کر فوراً پنکی کے ہاتھ سے وہ پرچہ چھین لیا۔ میں جلدی سے وہاں سے نکل گیا پھر شام کو میں دیر سے گھر آیا، ہمارے گھر میں ماتم کا سماں بنا تھا۔ میری ماں نے مجھے دیکھتے ہوئے کوسنا شروع کر دیا بے غیرت تجھے شرم نہیں آتی غیروں کی بچیوں کو خط لکھتا ہے تیرے گھر میں تین بہنیں بیٹھی ہیں۔ میرے والد صاحب بھی غصے میں لال پیلے ہو رہے تھے، میں نے ماں کو کہا، ماں جی! میں اکیلا اس کام میں شامل نہیں ہوں روبینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں آپ اُس سے بھی جا کر پوچھ لیں۔ میری ماں نے کہا، اچھا یہ بات ہے تو میں صبح اُس کی ماں سے بات کرتی ہوں، اگلے دن جب میری ماں اُن کے گھر یہ بات پوچھنے گئی تو روبینہ کی ماں ممانی اور روبینہ نے صاف انکار کر دیا کہ ایسا کچھ بھی نہیں آپ کے بیٹے میں ہی خرابی ہے ہم نے یہ رشتہ نہیں کرنا۔

پھر ایک آخری خط میں نے روبینہ کو سکول کے ایڈریس پر لکھا جس میں اُسے بتایا کہ کس طرح سے تم نے مجھے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا اپنی ماں باپ کی شادی کے بارے میں بتایا، میرے ساتھ زندگی گزارنے کے وعدے کئے، اور بے وفا آج تم نے انکار کر دیا۔ مجھے پہلی دفعہ عورت کی چالاکی اور مکاری پر حیرت اور دکھ ہوا، مگر روبینہ کا کوئی جواب نہیں آیا، تقریباً ایک ماہ بعد ہمیں پتہ چلا کہ روبینہ کی شادی اپنی عمر سے بڑے شخص سے کر دی گئی ہے جو کہ کسی پٹرولیم کمپنی میں افسر ہے۔

اس دوران میں بی اے کر چکا تھا، میں نے نوکری کے لئے دو تین جگہوں پر درخواستیں دے رکھی تھیں۔ ایک دن ایک کمپنی کی طرف سے لیٹر آیا، میں اسلام آباد جو آفس اُنھوں نے بتایا تھا وہاں ٹیسٹ دینے چلا گیا وہاں ٹیسٹ دینے والے بے شمار لوگ تھے تقریباً تین چار سو سے زیادہ لوگ تھے ہال بھرا ہوا تھا۔ ہمیں ہال میں بٹھا دیا گیا اور ایک پیپر تھما دیا گیا جس کو حل کرنا تھا پیپر میں دو سوال اسلامیات، دو انگریزی زبان، دو حساب کے بارے میں تھے اور دس Objective تھے جو کہ جنرل نالج کے بارے میں تھے۔ میں وہ پیپر دے کر گھر آ گیا مجھے پکا یقین تھا کہ نوکری نہیں

ملے گی کیونکہ نہ ہی میرے پاس سفارش تھی، اور نہ ہی اتنا پیسہ تھا کہ نوکری خرید سکتا۔

اس بات کو گزرے تین ماہ ہو گئے، تین ماہ کے بعد اسی کمپنی کی طرف سے انٹرویو کا لیٹر آ گیا، میں حیران رہ گیا کہ یہ کیسے ہو گیا، میں نے اِسے بھی دھوکہ سمجھا، سوچا ایسے ہی یہ ڈرامہ لگا رہے ہیں، کون بھلا مجھے نوکری دے گا؟ مگر میں بتائے ہوئے پتے پر انٹرویو دینے اسلام آباد چلا گیا، انٹرویو لینے والوں میں تین کمپنی کے آفیسر بیٹھے تھے، اُنھوں نے میری اوریجنل اسناد دیکھیں ڈومیسائل دیکھا اور پوچھا آپ یہاں اس کمپنی میں نوکری کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا جی، اس کمپنی کا پیکج اچھا ہے، میں نے چند برس ڈاک خانہ میں بھی ملازمت کی ہے مگر وہاں ترقی کا کوئی سکوپ نہیں تھا اس لئے میں نے وہ نوکری چھوڑ دی۔ اُن میں سے ایک صاحب نے کہا، آپ کے شناختی کارڈ پر محمد عابد لکھا ہوا ہے جب کہ آپ کی میٹرک کی سند پر عابد چوہدری لکھا ہوا ہے، میں نے کہا جی میرے والدین نے سکول میں اسی طرح لکھوایا تھا، اُنھوں نے کہا یہ تو آپ کے لئے مشکل ہو جائے گا آپ کے لئے یہاں نوکری ملنا۔ یہ بات سُن کر میرا چہرہ اُتر گیا اور میں مایوسی میں ڈوب گیا لیکن اچانک اُن تینوں میں سے ایک آفیسر جن کو کہ خالد صاحب کہہ کر وہ لوگ بلا رہے تھے اور وہ انٹرویو کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ اُنھوں نے کہا، نہیں نہیں متین صاحب رہنے دیں ٹھیک ہے کوئی بات نہیں، پھر مجھے خالد صاحب نے بڑے پیار سے کہا آپ باہر جائیں انشاء اللہ، اللہ خیر کرے گا۔

انٹرویو کے ایک ہفتے کے بعد مجھے کمپنی سے آفر لیٹر آ گیا جس میں لکھا گیا تھا کہ آپ کو ہم نے یو ڈی سی کلرک منتخب کر لیا ہے لہٰذا آپ یہ آفر لیٹر ملنے کے سات دن کے اندر آ کر جوائننگ دے دیں۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی سات دن کیا دو دن بعد ہی جا کر کمپنی کے ہیڈ آفس میں جوائننگ دے دی تین چار دن مجھے ہیڈ آفس کے ایچ آر ڈیپارٹمنٹ میں رکھا گیا پھر میری پوسٹنگ ایڈمن کے ایک سیکشن میں کر دی گئی جس کا انچارج رشید جنجوعہ تھا، یہ رشید جنجوا روبینہ کا میاں تھا، مگر میں نے جتنے برس بھی نوکری کی، کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ رشید جنجوعہ میرا رقیب ہے۔-----

رزق

آج اچانک صبح صادق کے وقت جب مجھے اپنے گھر کے صحن میں جانے کا اتفاق ہوا تو کافی عرصے بعد میں نے دیکھا کہ پرندوں کے جھنڈ جن میں کوے زیادہ تھے فضاء میں پرواز کررہے تھے۔ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے رزق کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ پھر مجھے اچانک اپنی دُنیا کا خیال آ گیا کہ تمام کے تمام لوگ مرد اور خواتین جہاں کہیں بھی ہوں، بچے نوجوان صبح سویرے اُٹھ کر اپنے رزق کی تلاش میں گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔کوئی مزدوری کرتا ہے،کوئی کلرک کوئی افسر ہے،کوئی بوٹ پالش کرتا ہے،کوئی رکشہ چلاتا ہے،کوئی ڈرائیور ہے،کوئی تندور میں روٹیاں لگاتا ہے،کوئی بال کاٹتا ہے،کوئی ترکھان ہے،کوئی جہاز چلاتا ہے،غرضیکہ تمام لوگ اپنی اپنی مزدوری، اپنی اپنی نوکری، اپنے بچوں کے رزق کے لئے گھروں سے باہر نکل پڑتے ہیں۔اُن کو یہ بھی خوف ہوتا ہے کہ ہم نے وقت پر اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے تاخیر نہ ہو جائے، تاخیر ہونے پر جواب دہی کا ڈر ہوتا ہے۔

ہم سب وہ کام کرتے ہیں، جس کیلئے میرے خیال میں ہمیں اِس جہان میں نہیں بھیجا گیا،اور اگر بھیجا ہے تو رب تعالیٰ نے جن و اِنس سے یہ وعدہ کیا ہے کہ تم لوگ رزق کی فکر مت کرنا، رزق دینا میرا کام ہے، یہ میرا وعدہ ہے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ رب تعالیٰ پتھر میں بھی کیڑے کو رزق عطا فرماتا ہے۔مگر میں کیا کروں کہ انسان اپنا اصل کام بھول چکا ہے،اور وہ کام ہے رب تعالیٰ کی اطاعت کرنا، اُس کے آگے سر جھکانا، مگر پگلا انسان پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لئے رزق کے بارے میں سب سے زیادہ کوشش کرتا ہے حالانکہ رزق صرف پیٹ کا نہیں ہوتا۔

میری ناقص رائے کے مطابق رزق آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، عقل، قلم اور شعور کا بھی رزق ہے۔اگر انسان سوچے تو اُس کو پتا چلے گا کہ پرندوں نے اور جانوروں نے تو یہ کوشش کی کہ وہ اُڑ کر اور جنگلوں اور کھلے میدانوں میں گھوم پھر کر اپنا رزق حاصل کریں، مگر انسان جو کہ اشرف المخلوقات

ہے، آپ غور کیجئے کہ پوری کائنات میں جتنے بھی جاندار، مخلوقات ہیں، وہ سب اپنا رزق منہ نیچا کر کے اُٹھاتے اور کھاتے ہیں، مگر حضرت انسان کو رب تعالیٰ نے فضیلت عطا فرمائی ہے کہ وہ رزق کو ہاتھ سے اُٹھا کر اپنے منہ تک لے کر جاتا ہے، یہ کتنی بڑی فضیلت اور کتنا بڑا اکرم ہے۔ اس پر کبھی آپ نے غور کیا کہ انسان کو رب نے خیر اور شر کی تمیز سکھائی اور اُس کو انسانوں کی بھلائی کے لئے پیار اور محبت کرنے کی توفیق دی اور ہم لوگ ہیں کہ صرف اور صرف اپنے پیٹ کے رزق کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، بناء دیکھے، بناء سوچ سمجھے کہ یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ کیا صرف دُنیاوی رزق ہی سب کچھ ہے جس کی خاطر حضرتِ انسان جھوٹ بولتا ہے، فریب دیتا ہے، نوسر بازی کرتا ہے، ڈکیتیاں کرتا ہے، چوریاں کرتا ہے، زن زر اور زمین کی خاطر اپنے بھائیوں اور بہنوں کا قتل عام کرتا ہے، زمینیں اور گھر چھین لیتا ہے لیکن اُس کے اندر کی لالچ اور حرس ختم نہیں ہوتی، کیا یہ انسانیت ہے؟

کیا حضرتِ انسان کا یہی کام رہ گیا ہے بھلے وہ کتنے ہی عہدوں پر فائز ہو جائے، خدا کے لئے آیئے ہم سب بیٹھیں، سوچیں کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے پہلے ہمیں یہ عمل اپنے گھر سے شروع کرنا چاہیے، میں اپنے گھر کے افراد کو اپنے بچوں کو ایسی تعلیم و تربیت دینے کی کوشش کروں گا جو کہ ہمارے بدن اور روح کے مطابق ہو، اور جس کے ذریعے ہم ایسا رزق حاصل کر سکیں جو حلال ہو، طیب ہو۔ اس کیساتھ ساتھ ہماری آنے والی نسلوں کے اندر ایمانداری ہو، خلوص، محبت، اخوت، بھائی چارہ ہو جو کہ ہمارے ملک کے لئے بابرکت ہو، ہم دل کی مانند ایک مٹھی بن جائیں اور مٹھی کے اندر دھڑکنوں کی طرح دھڑکیں۔ ہمارا ملک ہمارا سب کچھ ہے۔ خدارا آیئے ہم سب مل کر اپنے ملک میں محبت کی فضاء قائم کریں، محبت کا، پیار کا، اخلاق کا، درگزر کا رزق بانٹیں، میل جول کا رزق بانٹیں تا کہ ہم لوگ جو کہ روزانہ اپنے دنیاوی رزق کی خاطر صبح سویرے گھروں سے نکلتے ہیں اُس رزق میں یہ تمام رزق شامل کریں۔

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں حرفِ دُعا یاد نہیں

صدیقہ بیگم سے صدیقہ آپا تک

صدیقہ بیگم جن سے میری پہلی ملاقات 1989ء میں اسلام آباد میں جناب ممتاز مفتی کے گھر میں ہوئی G-6 اسلام آباد میں یہ گھر اُن دنوں ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے ادیب شاعر اور درویش صفت لوگ آ کر مفتی صاحب سے استفادہ کرتے، میری عمر اُس وقت تقریباً 27 برس کی تھی میں بیساکھیوں کے سہارے چلا کرتا تھا اور اپنے گھر سے جو کہ سیٹلائٹ ٹاؤن صادق آباد میں واقعہ ہے سوزوکی میں بیٹھ کر مری روڈ سینٹرل ہسپتال میں اترتا اور پھر روڈ کراس کر کے اسلام آباد جانے والی ایک نمبر ویگن پر بیٹھ جاتا۔ اکثر ویگنوں والے مجھے نہیں بٹھاتے تھے وہ کتراتے تھے میرے سے کیونکہ میرے دونوں ہاتھوں میں بیساکھیاں ہوتی تھیں اور میری سیدھی ٹانگ فولڈ نہیں ہوتی تھی سیدھی رہتی تھی۔ جب میں ویگن میں بیٹھتا تو کنڈیکٹر مجھے غصے سے دیکھتا کوئی سواری آ جاتی تو کنڈیکٹر مجھے بار بار گھورتا اور کہتا، بھائی جی ذرا اِدھر ہونا ذرا اُدھر ہونا۔ اکثر میری عزت نفس مجروح ہوا کرتی مگر مجھے شوق تھا مفتی صاحب سے ملنے کا اُن کے گھر جا کر۔ کبھی کبھی لاہور سے اشفاق بابا جی، بانو قدسیہ، مسعود قریشی راولپنڈی سے، منشاء یاد صاحب اسلام آباد سے اور اسی دوران جب ایک دن میں مفتی صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا تو ایک سانولی سالونی خاتون میں نے پہلی مرتبہ دیکھی۔ اُن سے میرا مختصر سا پہلا تعارف ہوا وہ اُس وقت شاید تیس سال کی لگتی تھیں مگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ 50 سے زیادہ عمر کی تھیں بہت خوبصورت۔ جو میں نے پہلا تاثر لیا اُن کی شخصیت کا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک مغرور، خودسر اور بے باک خاتون ہیں، جب بات کرتیں تو دوسرے کو بولنے نہیں دیتی تھیں مگر مفتی صاحب اُن کی باتوں کو بہت انجوائے کرتے تھے۔ مجھے اُس وقت پتا چلا کہ یہ صدیقہ بیگم ہیں جو کہ رسالہ ''ادبِ لطیف'' کی سرپرست ہیں، مالک ہیں یا مالک کی بیٹی ہیں۔ اردو ادب میں ''ادبِ لطیف'' کا بہت بڑا مقام ہے جس شخص کا کلام یا تحریر ادبِ لطیف میں ایک بار چھپ جائے وہ ایک مستند ادیب یا شاعر تسلیم کر

لیا جاتا اردو ادب میں۔ہم اُس وقت نئے نئے لکھنے والے تھے اور ادب کے طالب علم تھے۔مگر ہمیں یہ فخر حاصل رہا ہے کہ ہم جیسے پتھر پارس جیسے ادبی لوگوں کے قدموں میں بیٹھے اور حرف کی توقیر کو بیان کرنے کا سلیقہ سیکھا۔

کافی عرصے تک صدیقہ بیگم سے خواہش ہوتے ہوئے بھی میں رابطہ نہ کر سکا چونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ ڈانٹ دیں گی۔پھر ایک دفعہ آج سے کوئی دس سال پہلے میں ''داستان سرائے'' 121 ماڈل ٹاؤن لاہور میں ماں جی بانو قدسیہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہاں پر صدیقہ بیگم آئیں۔ملازم نے آکر بتایا کہ صدیقہ بیگم آئیں ہیں، بانو قدسیہ نے کہا انھیں اندر ہی لے آؤ، جب وہ اندر داخل ہوئیں تو انھوں نے بہت خوبصورت لباس زیب تن کر رکھا تھا، گرمیوں کا موسم تھا بھانجی شہناز ہمایوں انکے ہمراہ تھیں۔میری خوشی کی انتہا نہ رہی وہاں پر بانو ماں جی نے میرا تعارف کروایا وہ بانو قدسیہ کو ''مامی جی'' کہتی تھیں کیونکہ رشتے کے اعتبار سے اشفاق بابا جی صدیقہ بیگم کے ماموں تھے اور اشفاق بابا جی کے منچلے بیٹے انیس احمد کی شادی صدیقہ بیگم کی بیٹی شہلا کے ساتھ ہو چکی تھی، بانو ماں جی اور صدیقہ بیگم آپس میں سمدھن بھی تھیں۔

پہلی دفعہ میں نے صدیقہ بیگم سے بات چیت کی اور تعارف ہوا اُن کی خوبصورتی اور اُن کی شخصیت کے حصار میں، میں گرفتار ہو گیا وہ اب بھی بے باک نڈر اور کسی حد تک بدلحاظ تھیں جب بھی وہ بات کرتیں اُن کا خیال ہوتا کہ جو میں بات کر رہی ہوں اُس پر توجہ دی جائے باقی سب چپ رہیں مگر مجھے وہ اچھی لگتی تھیں۔مجھ سے اُنھوں نے پوچھا، امین کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا میں آپ کو کافی عرصے سے جانتا ہوں میں نے آپ کو پہلی دفعہ 1989ء میں اسلام آباد میں ممتاز مفتی صاحب کے گھر میں دیکھا اور آج پہلی دفعہ داستان سرائے میں آپ سے بات ہو رہی ہے آپ میری فیس بک فرینڈ بھی ہیں مگر میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں آپ سے میسنجر پر چیٹ کر سکوں۔تو وہ ہنس پڑیں اور پنجابی میں بولیں، امین میں (اڈی پیڑھی تے نہیں)۔بانو ماں جی نے میرا تعارف کروایا کہ امین پنجابی اردو کا شاعر ہے بابا جی سے بھی اس کا تعلق رہا ہے، جہلم میں پرائم کلاس والے جو ہیں سعید خان صاحب وہ اور اس کے والد دوست رہے ہیں، سعید خان صاحب اور اس کے تایا نے

1938ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اکٹھے کیا تھا، بعد میں اس کے تایا انڈین فارن سروس میں چلے گئے اور پھر ملک تقسیم ہونے کے بعد پاکستان فارن سروس میں آ گئے۔

صدیقہ بیگم نے مجھے تھوڑا زیادہ پیار سے توجہ دی میں نے ڈرتے ڈرتے اُن سے اُن کا فون نمبر مانگا اُنھوں نے بھانجی سے کہا (شہناز اینوں میرا نمبر لکھا دے)۔ میں بڑا خوش ہوا اور واپس اپنے گاؤں کنجاہ گجرات آ گیا، میں نے کوئی ایک دو مہینے بعد صدیقہ بیگم کو فون کیا کافی بیلیں جانے کے بعد انھوں نے فون اُٹھایا۔ پوچھا، کون بول رہا ہے؟ میں نے کہا، امین کنجاہی۔ ''امین اوجیہڑا امینوں بانو قدسیہ دے گھر ملیا سی؟'' میں نے کہا، جی وہی۔

پھر اُن کے ساتھ وقتاً فوقتاً فون پر بات ہوا کرتی، صدیقہ بیگم مہینے دو مہینے بعد ایک ادبی محفل لگایا کرتی تھیں، کیفے نائٹ گلبرک پر میں اگر نام بھول نہیں رہا تو، مجھے بھی بلایا کرتی تھیں میں کبھی محفلوں میں شریک ہو جایا کرتا کبھی کچھ ذاتی مجبوریوں کی بناء پر نہیں جا سکتا تھا۔ صدیقہ بیگم نے ایک ایسا گروپ جوائن کیا ہوا تھا جو تقریباً دو سال کے بعد کسی نہ کسی بیرون ملک کا ٹور ترتیب دیا کرتے تھے کبھی میکسیکو، کبھی یورپ کا کوئی ملک، کبھی ترکی۔ لاہور میں جو فنکشن ہوا کرتے تھے ان میں میری ملاقات مظہر سلیم ماجو کہ، شوق جعفری، پنجابی شاعر شاہد صاحب، ایوب خاور اور باصر کاظمی جو کہ ناصر کاظمی کے بیٹے ہیں سے ہوئی، وہ میرے اچھے دوست بن گئے۔ یہاں پر ہی سہیل کیانی، انجینئر ظفر محی الدین اور طاہر شاہ صاحب جیسے لوگوں سے میری ملاقات اور دوستیاں ہوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد صدیقہ بیگم نائن گرین ہیکرز میں منتقل ہو گئیں جو کہ رائیونڈ روڈ پر واقع تھا پھر ایک دن جب میں اپنی فیملی کے ساتھ لاہور گیا تو میں نے فون کیا، آپا جی میں لاہور آیا ہوں اور میں نے آپ سے مل کر جانا ہے۔ تو انھوں نے کہا، یہ میرے گھر کا ایڈریس ہے 9 گرین ہیکرز رائیونڈ روڈ مگر امین سڑک بن رہی ہے تجھے مشکل پیش آئے گی، میں تو کہتی ہوں تو مت ملنے آ پھر کبھی آ جانا۔ مگر میں نے ضد کی اور کہا، نہیں آپا جی میں نے آنا ہے میں نے کتاب بھی دینی ہے آپ کو کتاب لے کر آیا ہوں۔

اُن دنوں میرا چھوٹا بھائی جو کہ اُس وقت کرنل تھا اُس کی گاڑی اور ڈرائیور لے کر میں نائن گرین

ہیکر ز کی تلاش میں نکل پڑا۔ کافی جدوجہد اور ڈرائیور کی مستقل مزاجی کی وجہ سے ہم لوگ نائن گرین ہیکر ز پہنچ گئے، ہم نے گاڑی کا ہارن دیا بہت بڑے گھر میں سے ملائشیا کپڑوں میں ملبوس ایک سکیورٹی گارڈ باہر آیا۔ اُس نے پوچھا، کون؟ میں نے کہا، جی امین کنجاہی۔ کہتا، ٹھہریں اُس نے اندر اپنے وہاں چوکی نما کمرے میں جا کر فون پر اطلاع دی۔ اندر سے مثبت جواب آیا اور گھر کا بڑا گیٹ ہماری گاڑی کے لئے کھول دیا گیا۔

جب ہم گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے تو دو تین بھاری بھر کم کتے جرمن شیپرڈ ہماری گاڑی کو سونگھنے لگ پڑے، اندر پانچ چھ ملائشیا یونیفارم میں گارڈز گنز لئے کھڑے تھے۔ جب گاڑی برآمدے میں رُکی تو میں نے دیکھا دوسری طرف صدیقہ آپا کھڑی ہیں بال سفید ہو چکے ہیں تھوڑی بیمار سی نظر آ رہی تھیں۔ کتے اور باڈی گارڈ پیچھے ہٹ گئے، ہم گاڑی سے باہر نکلے پھر صدیقہ بیگم نے میرے بچوں سے ملاقات کی اور ہمیں اندر ایک بہت بڑے ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا کیونکہ میں پہلی دفعہ گرین ہیکر ز آیا تھا تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اُن کے لئے کیا لے کر جاؤں؟ بالکل آخری لمحے پر جب ہم مختلف لوگوں سے گرین ہیکر ز کا راستہ پوچھ رہے تھے تو ایک سائیکل والا جسکے پاس کینوں کا ٹوکرا تھا تو میں نے ڈرائیور سے کہا کوئی ڈھائی درجن اچھے اچھے کینوں لے آ۔

میں نے وہ کینوں صدیقہ آپا کے سامنے رکھ دیئے میرے بیٹے خضر نے وہ لفافہ اُٹھایا ہوا تھا۔ میں نے صدیقہ آپا سے اپنے بچوں کا تعارف کروایا کہ آپا جی یہ میری بڑی بیٹی قدسیہ فار مسٹ ہے اور یہ میرا بیٹا خضر امین ہے یہ اسلام آباد کی ایک مقامی یونیورسٹی میں آئی آر کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی خدیجہ امین ہے جو ابھی ساتویں کلاس میں پڑھ رہی ہے اور یہ میری وائف رانی ہے جو کہ شوگر، بلڈ پریشر اور بڑی آنت کے کینسر کی مریضہ ہے۔ تو صدیقہ آپا نے حیران ہو کر کہا اتنی چھوٹی عمر میں اس کو اتنی زیادہ بیماریاں لگ گئیں۔ پھر مجھ سے پوچھا، کیا پیو گے؟ میں نے کہا آپا جی میں نے چائے پینی ہے اور وہ بھی سٹرونگ۔ آپا جی نے کہا وہ بھی چائے پئیں گیں رانی نے بھی چائے کا آرڈر دیا۔ بچوں نے کہا ہم جوس پئیں گے، ملازم اُن کے لئے جوس لے آیا اور ہم لوگوں نے چائے پی۔

میں صدیقہ بیگم کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اُن کو اپنی کالموں کی کتاب ''ایمانداریاں'' پیش کیں کمرے کی لائٹ ڈم تھی ماحول بڑا ڈارک گھرا گھرا سا تھا۔ میں نے آپا جی سے کہا، آپ کا اتنا بڑا گھر ہے اتنے ملازم ہیں اتنے باڈی گارڈز ہیں؟ تو وہ ہنس کر کہنے لگیں نہیں وے میں تو یہاں اپنی بیٹی کے گھر ٹھہری ہوں یہ شہلا کا گھر ہے یہ اُس کی مہربانی ہے کہ مجھے رکھا ہوا ہے۔

بڑے پیار سے وہ مجھ سے ملیں، پھر میرا اور اُن کا تعلق بہت زیادہ مضبوط ہو گیا۔ پہلے میں اُن کو مہینوں بعد فون کرتا تھا پھر میں انھیں ہفتے دس دن بعد فون کرنے لگ پڑا۔ انھوں نے مجھے اپنا پی ٹی سی ایل کا ایک کا نمبر بھی دے دیا، میں نے اُن سے کہا، آپا جی ادبِ لطیف کا 80 سالہ نمبر آرہا ہے تو میں نے بھی اپنی کوئی چیز بھیجنی ہے اُس میں شائع کرنے کے لئے۔ انھوں نے کہا، اچھا یہ ای میل لے لو اس میں اپنی کوئی چیز بھیج دینا اگر قابل اشاعت ہوئی تو شائع ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔

اکثر جب لاہور کا موسم تبدیل ہو جاتا تو اُن کو الرجی ہو جاتی، سانس اکھڑ جایا کرتا تھا، پھر وہ اس الرجی سے بچنے کے لئے دبئی چلی جایا کرتی تھیں وہاں پر بھی شہلا کا ایک فلیٹ تھا۔ شہلا کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اُس کا داماد دبئی میں کام کرتا تھا، ہم صدیقہ آپا سے واٹس ایپ پر کبھی کبھار بات کر لیا کرتے تھے پھر آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی۔ ایک دن مجھے شہناز ہمایوں کا فون آیا کہ صدیقہ آپا سخت بیمار ہیں دُعا کرو۔ جب میں نے اُن کے نمبر پر فون کرنے کی کوشش کی تو کسی اور نے فون اُٹھایا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ صدیقہ آپا کی طبیعت کیسی ہے تو اُنہوں نے کہا بس دُعا کریں اگلی صبح جب میں اُٹھا تو میرے موبائل پر شہناز ہمایوں کا ایس ایم ایس آیا ہوا تھا کہ صدیقہ آپا جو کہ صدیقہ بیگم کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھیں اب اس جہان میں نہیں رہیں۔ میں سکتے کے عالم میں آ گیا کہ ایک پورا دور ادبی لحاظ سے لاہور کی ثقافت سے ختم ہو گیا مگر ''ادب لطیف'' کے سرپرست اعلیٰ ہونے کے ناطے سے اردو ادب میں انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

05 مئی 2020ء

اُردو ادب اور صحافت میں خواتین کا کردار

18 اور 19 ویں صدی کے اُردو ادب میں خواتین شعراء کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، کچھ تذکرہ نگاروں نے خواتین شعراء کا ذکر محض ایک گزرتے ہوئے حوالے کے طور پر کیا ہے اگر چہ بہت سی خواتین اُردو میں کئی برسوں سے شاعری کر رہی تھیں۔ حکیم فصیح الدین رنج مروٹھی (1885-1836) جو کہ غالب کے شاگرد تھے، انھوں نے تاریخ تخلیق کی جو انھوں نے 1864ء کے ''بہارستان ناز'' میں شائع کی اس میں برصغیر میں اردو کی خواتین شعراء کا پہلا مرتب شدہ تذکرہ ہے اس میں 70 خواتین شاعروں کو متعارف کروایا گیا اور اُن کی شاعری کے نمونے دیئے گئے۔ 1869ء میں شائع ہونے والے ''بہارستان ناز'' کے دوسرے ایڈیشن میں کوئی اضافی معلومات نہیں دی گئیں تاہم تیسرے ایڈیشن میں جو کہ 1882ء میں شائع ہوا اس میں 174 خواتین شعراء کا ذکر ملتا ہے اس دور میں خواتین شعراء کی تعداد یقیناً کہیں زیادہ ہوگی کیونکہ اُن دنوں خواتین ادیبوں نے اپنی تحریروں کو عام کرنا پسند نہیں کیا تھا، اور ان میں سے ایک بڑی تعداد نے بھی نامعلوم رہنے کو ترجیح دی ہوگی یہاں تک کے 20 ویں صدی کی خواتین لکھاریوں کو بھی اپنی شناخت چھپانی پڑی کیونکہ عام طور خواتین کے نام سے لکھا ہوا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا زاہدہ خاتون شیروانیا (1922-1894) مثال کے طور پر ایک بہت ہی باصلاحیت شاعرہ تھیں جو کہ بہت کم عمری میں فوت ہوگئیں اور اپنی شاعری اپنے پورے نام کی بجائے ابتدائی نام ذے شین کے ذریعے شائع کرتی تھیں۔ بہارستان ناز نے برصغیر کی خواتین کی شاعرانہ صلاحیتوں پر تحقیق کرنے پر اکسایا ایسی کتابوں میں زیادہ قابل ذکر کتاب ہے درگاہ پرشاد سرہندی دہلوی کی گلشن ناز فارسی کی خواتین شعراء کا ایک مختصر تذکرہ جو 1876ء میں شائع ہوا تھا اس نے 1878ء میں ایک

اور تذکرہ اردو اور فارسی کی زیادہ خواتین شعراء سے تعارف کرواتے ہوئے شائع کیا اور اس کا نام ''چمن انداز'' رکھا۔ نادر نے 1884ء میں ''تذکرہ تن نساء نادری'' شائع کیا جو اس کی تین ایسی ہی تخلیقات کا مشترکہ مجموعہ ہے۔ خلیل الرحمان داؤدی نے شائع شدہ ورژن کو تفصیلی تعارف کے ساتھ 1965ء میں شائع کیا خوش قسمتی سے یہ مجلس اب بھی دستیاب ہے۔ بدقسمتی سے یہ ہمارے معاشرے کی پڑھنے کی عادات پر ایک متناسب تبصرہ ہے کیونکہ 50 سال قبل شائع ہونے والی ایک کتاب کے نسخے ابھی بھی دستیاب ہیں۔ شاعری اور تذکرہ کو چھوڑ کر ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے خواتین اُردو رسالوں اور رسالوں کی ترمیم کر رہی ہیں اسی طرح خواتین کے لئے خصوصی طور پر شائع ہونے والے میڈیوں کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے لیکن اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

اب ڈاکٹر جمیل اختر جو ہندوستان سے ایک سکالر ہیں نے خواتین کے اُردو رسالوں کی ایک تاریخ شائع کی ہے دہلی کے کتابی دنیا کے ذریعے اُردو میں جرائدِ نسواں میں دو جلدوں میں شائع ہوا اس نے اُردو میں خصوصی طور پر خواتین کے لئے شروع کی جانے والی 250 خواتین کے بارے میں نایاب جلدیں شائع کیں، جلدوں میں 1947ء سے لے 1947ء تک کی تاریخ کی وضاحت کی گئی ہے اور دوسری جلد 1947ء کے بعد کی مدت کا احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل اختر کے مطابق رفیق نسان، ایک اردو اور ہندی کے 15 مارچ کو لکھنو سے ایک کرسچن مشنری نے 05 مارچ 1884ء کو کام شروع کیا برصغیر میں خواتین کے لئے خصوصی طور پر شائع ہونے والا یہ پہلا رسالہ تھا۔ سید احمد دہلوی نے یکم اگست 1884ء کو دہلی سے 15 روزہ اخبار، اخبارِ نساء کا آغاز کیا اور معلم نسوان حیدر آباد دکن سے، 1894ء حقیقت میں 1881ء میں لانچ کیا گیا تھا اور اس کا نام معلم تھا یہ خواتین کا رسالہ نہیں تھا، لیکن بعد میں اس نے نام بدل لیا اور اس کی زیادہ تر کوششیں برصغیر کی خواتین کی بہتری کے لئے وقف کر دی گئیں اگرچہ ابتدائی ردعمل حوصلہ افزاء نہیں تھا اور ابتدائی خواتین کے رسائل کو جلد ہی اشاعت روکنا پڑی، لیکن اس نے دوسرے آنے والوں شریف بیان لاہور 1893، تہذیب نسوان لاہور 1898 پردہ عصمت کو روکنے میں ناکام رہا۔

محمدی بیگم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ خواتین کے لئے کسی بھی اردو رسالے کی پہلی خاتون ایڈیٹر ہونے کی حیثیت رکھتی ہیں انھوں نے تحریر نسواں کی ترمیم کی۔ بیگم ستار علی 1905 میں لاہور سے لانچ ہونے والے خواتین کے رسالہ جو 1905ء میں آگرہ سے لانچ کیا تھا، ان رسائل اور جرائد نے خواتین میں شعور اجاگر کرنے اور ان کی تعلیم میں اہم کردار ادا کیا۔ زیر کتاب کی پہلی جلد میں اردو اخبارات کے خصوصی حوالہ کے ساتھ برصغیر میں پرنٹ صحافت کے آغاز اور ابتدائی مراحل کی وضاحت کی گئی ہے اس میں 19ویں اور 20ویں صدی میں شائع ہونے والی خواتین کے 100 اردو رسالوں پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا گیا ہے دوسری جلد میں 1947 کے بعد پاکستان میں اس طرح کے 100 سے زیادہ رسالوں کی فہرست اور تجزیہ کیا گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ 1947ء کے بعد ہندوستان میں جاری خواتین کے اردو رسائل کی تعداد 40 سے زیادہ نہیں تھی کتاب میں دی گئی معلومات کے بہت سارے حصے خاصے اہم ہیں، اور پاکستانی قارئین کے لئے یہ بہت کم ہوتا ہے کیونکہ ہندوستانی اشاعتیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی ہیں بیرون ملک بھی شائع ہونے والی چند خواتین کے اردو رسائل کو کتاب میں پیش کیا گیا ہے کتاب میں شامل بہت سے نادر رسالوں کے عنوانات کے صفحات کی سکین شدہ تصاویر اور کچھ نایاب معلومات کے ساتھ یہ طلباء اور بڑے پیمانے پر مواصلات اور اردو ادب کے سکالرز کے لئے لازمی طور پر پڑھنا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک حوالے کے طور پر کام کرسکتا ہے۔

شیشہ ڈور

سردیوں کا موسم اس لحاظ سے بہت اچھا ہوتا ہے کہ اگر بجلی اور گیس نہ بھی ہو تو انسان گھر میں آرام سے اپنے بستر میں گھس کر لیٹ سکتا ہے سو بھی سکتا ہے۔ اس موسم میں نہ تو مچھر تنگ کرتے ہیں نہ ہی مکھیاں نہ ہی کیڑے مکوڑے پرانے گھروں کی در و دیوار سے باہر نکل پاتے ہیں، جبکہ گرمیوں میں یہ تمام چیزیں آپ کو ملیں گی بجلی نہ ہو تو شدید گرمی اور پسینہ، مکھیوں مچھروں کی بھرمار اور طرح طرح کے کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ سانپ تک بھی پرانے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ اُس روز بھی شدید گرمی تھی، جس روز میں نے اُسے پہلی دفعہ ماسی برکت جو کہ ماچھن تھی، اور اپنے تندور پر بیٹھی روٹیاں لگا رہی تھی، ماسی برکت اپنے کام میں بڑی ماہر تھی اُس کا چہرہ اور کپڑے پسینے سے شرابور تھے اور اُس کے اردگرد پورے محلے کی خواتین اپنا اپنا آٹا اُٹھائے روٹی لگوانے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ماسی برکت کا تندور گاؤں کے لوگوں کے لئے "بی بی سی" کا کام کرتا تھا کیونکہ اس تندور پر ہر طرح کی گفتگو کی جاتی تھی اور ہر طرح کی خبریں یہاں سے ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کی جاتی تھیں۔

ماسی برکت۔۔۔۔اجو نے کہا، آپ کو پتا ہے شمع کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔ ماسی نے تندور سے روٹی نکالتے ہوئے کہا، ہائے ہائے کس کے ساتھ بھاگ گئی؟ اجو نے کہا، ماسی وہ کبوتر باز نہیں تھا شمع کے ہمسائے میں لڑکا کیا نام ہے اُس کا بھلا! ہاں وہ اپنا گکو لوہار اُس کے ساتھ بھاگی ہے۔ باقی خواتین جو وہاں پر بیٹھی تھیں ایک دوسرے کے ساتھ چہ میگوئیاں کرنے لگ پڑیں، ہائے ہائے توبہ استغفار، اللہ پاک اپنی پناہ میں رکھے بیٹیوں کی عزت پر پردہ پڑا رہے اُن کی آنکھوں میں حیا قائم

رکھے۔ ماسی برکت جب تندور پر روٹی لگا رہی ہوتی اور روٹیوں کی پہچان کے لئے تا کہ کسی کا آٹا کسی دوسرے کے آٹے سے نہ مل جائے تو وہ آٹے کے پیڑوں میں باریک باریک تیلی رکھ دیتی نشانی کے طور پر کہ یہ آٹھ روٹیاں چھیموں کی ہیں، چھ اجو کی ہیں، پانچ فیقے نائی کا پتر جو آیا ہے اُن کی ہیں۔ دراصل گاؤں میں کسی بھی شخص یا آدمی کا جب بھی نام لیا جاتا ہے تو اُس کے ساتھ اُس کے پیشے کا نام ضرور لیا جاتا ہے جیسے کہ شفیع لوہار، علی اکبر ترکھان، فیقہ نائی، ضمیر درزی، حنیف موچی، اور شیدہ ٹانگے والا۔

ماسی برکت کی ایک بیٹی جو کہ بہت خوبصورت تھی کبھی کبھی تندور پر آیا کرتی تھی اور ہم جیسے نئے نئے جوانوں کے دل کی دھڑکنیں تیز کر جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تندور پر عورتوں کی لڑائیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں پھر ماسی برکت بڑے ہی طریقے سے ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو قابو کرتی، کسی کو ڈانٹ کر کسی سے پیار کے ساتھ بات کر کے، نہ پتر نہ اینج نئی کریدا آگے گرمی بہت ہے اوپر سے تندور بھی بہت گرم ہو رہا ہے تم لوگ کیوں اور زیادہ گرمی پیدا کر رہی ہو۔ ایک دن ماسی برکت نے کہا کہ کل تندور بند رہے گا کیونکہ میری بیٹی کی شادی ہے۔ سب عورتیں جو وہاں موجود تھیں انھوں نے ماسی کو مبارک باد دی اور میں جو اپنے گھر سے روٹیاں لگوانے گیا ہوا تھا میرا دل ٹھک سے ٹوٹ گیا مجھے ایسے لگا جیسے میری دُنیا اندھیر ہو گئی ہے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، میں خاموشی سے اُٹھا اپنا آٹا تندور سے اُٹھایا اور بڑی مشکل سے گھر پہنچا۔ جب گھر میں داخل ہوا تو چھوٹے بہن بھائیوں نے کہا اماں روٹیاں آ گئی ہیں جلدی سے سالن ڈالو ہمیں بھوگ لگی ہے مگر جب میں نے اماں کو پکی ہوئی روٹیوں کے بجائے کچا آٹا ہاتھ میں تھمایا تو میری ماں نے پوچھا عابد کیوں تندور بند تھا؟ مگر میں کوئی جواب نہ دے سکا، میں نویں جماعت کا طالب علم تھا میرے اندر تو ایک اور ہی تندور جل رہا تھا، جس میں میری خواہش جھلس رہی تھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں ماں کو کیا جواب دوں۔ بس ماں کو اتنا ہی کہہ سکا کہ اماں کل تندور بند ہو گا ماسی برکت کی بیٹی کی شادی ہے۔ پھر تین دن تک تندور بند رہا اور محلے میں لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے کہ یار وہ ماسی برکت کی بیٹی کی شادی ہو گئی ہے جس شخص سے اُس کی شادی ہوئی ہے وہ عمر میں اُس سے دگنا

بڑا ہے مگر پیرس میں رہتا ہے۔
جب میں نے یہ سنا کہ سکینہ پیرس جائے گی تو مجھے اور تکلیف ہوئی گو کہ میں نے کبھی اُس سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ پیرس والا شخص نا جانے کیوں میرے سامنے میرا رقیب بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔
پھر اس بات کو پانچ سال بیت گئے میں میٹرک کرنے کے بعد کالج میں چلا گیا، ایک دن جب میں شہر سے گاؤں واپس آیا تو پتا چلا کہ سکینہ پیرس سے آئی ہوئی ہے اب اُسے لوگ سکینہ نہیں ''سکی'' کہتے ہیں اور ماسی بہت خوش ہے کیونکہ سکینہ اپنے ساتھ اس دفعہ اپنے دو بھائیوں کا ویزہ بھی لے کر آئی ہے جو کہ گاؤں میں نکھے اور جواری ہوا کرتے تھے سکی نے اپنی ماں کے لئے نیا گھر بنانے کا بھی پروگرام بنا رکھا ہے۔ جب کہ ماسی برکت کہتی ہے، نہیں پتر میرے لئے یہ پرانا گھر ہی ٹھیک ہے مگر سکینہ بضد ہے کہ نہیں اماں ہم نے نیا گھر بنانا ہے۔
پھر سکینہ ایک مہینہ رہنے کے بعد اپنے دو بھائیوں کو لے کر پیرس چلی گئی اور میں اپنی نوکری کے سلسلے میں واہ کینٹ شفٹ ہو گیا، مجھے واہ کینٹ میں ہی پتا چلا کہ ماسی برکت بھی پیرس چلی گئی ہے میں سوچ میں پڑ گیا کہ ماسی برکت نے ایک بیٹی پیدا کی اور چار بیٹے، بیوہ ہوگئی اور تندور پر بیٹھ گئی مگر اُس کی بیٹی نے دگنی عمر کے آدمی سے شادی کر کے اپنے پورے خاندان کو خوشیوں سے مالا مال کر دیا بھلے اُس کے دل میں کسی اور کے لئے محبت ہوگی لیکن اُس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اپنی خواہشوں کو قربان کر دیا۔
پھر ایک دن میں اپنے گاؤں میں گوندل چوک کی طرف سے گھر جا رہا تھا راستے میں دیکھا کہ ماسی کا تندور بند ہے اور اُس کے پرانے گھر کی جگہ تین منزلہ نئی عمارت کھڑی ہے اور ماسی اُس عمارت کے باہر دروازے پر کھڑی اپنے پیرس کے واقعات اپنے محلے والی خواتین کو سنا رہی ہے کہ وہاں پر تو ایسے ایسے شیشہ ڈور گھر ہیں کہ بندہ حیران پریشان ہو جاتا ہے مشین والی پوڑیاں ہیں بٹن دباؤ تو جھٹ اوپر اور جھٹ نیچے۔ محلے کی ساری خواتین حیرانگی سے ماسی برکت کی باتیں سن رہی تھیں۔
کچھ دن کے بعد ماسی برکت پھر پیرس چلی گئی ہمارے گاؤں کا رواج ہے کہ ہر گھر میں سے کوئی نہ کوئی کسی بیرون ملک میں ضرور رہتا ہے کوئی جرمنی، کوئی یونان، کوئی اٹلی، کوئی آئیر لینڈ، قطر، دبئی،

سعودیہ، پرتگال، سپین، حتیٰ کہ جس ملک کا بھی آپ نام لیں ہمارے گاؤں میں سے کوئی نہ کوئی نوجوان وہاں گیا ہوگا۔

اسی طرح میں بھی ایک دن واہ فیکٹری سے ہوتا ہوا قطر جا پہنچا وہاں ایک پیٹرولیم کمپنی میں مجھے نوکری مل گئی ہمارے مالی حالات دونوں بہتر ہونا شروع ہو گئے شروع شروع میں، میں نے اپنے گھر دس ہزار روپے ماہانہ بھیجنا شروع کر دیئے۔ میری ان پڑھ ماں کے لئے یہ دس ہزار روپے بہت زیادہ تھے، ماں نے اُن پیسوں کو بچانا شروع کر دیا تا کہ جب میرا بیٹا واپس آئے تو میں اُس کی شادی کروں حالانکہ گھر میں ابھی میری دو بہنیں غیر شادی شدہ بیٹھی ہوئی تھیں اُن کی شادی کرنا میرے ذمے تھا کیونکہ والد صاحب کورے ان پڑھ تھے اور انھوں نے ساری عمر کوئی کام نہیں کیا اور اگر کبھی کوئی کام کیا بھی یا کوئی دُکان ڈالی بھی تو ہمیشہ گھاٹا ہی پڑا۔ میری ماں جو کہ نہایت سگھڑ خاتون تھی اپنے جہیز کے زیورات ایک ایک کر کے بیچتی رہی ہمیں پڑھاتی رہی اور بڑی بہنوں کی شادیاں بھی کرتی رہی۔ کیونکہ ہمارے ہاں کوئی بھی پیرس سے رشتہ نہیں آیا تھا جیسا کہ ماسی برکت کی بیٹی سکینہ کا آیا تھا جو اپنے سارے خاندان کو پیرس لے گئی تھی۔

آج لوگ ماسی برکت کا نام بھول چکے ہیں اور اُسے ''ماسی شیشہ ڈور'' کہتے ہیں۔۔۔اب کئی برس ہو گئے ہیں ماسی برکت کے اُس مکان کو بنے ہوئے مگر کوئی بھی اُس گھر میں نہیں رہتا نہ ہی کوئی تندور پر روٹیاں لگاتا ہے۔

سوکو

روز تقریباً پونے چار بجے سہ پہر میرے دل میں بے چینی شروع ہو جاتی، میں اپنے گھر کا مین گیٹ کھولتا، اور ویل چیئر پر بیٹھ کر دائیں جانب راستے پر نظریں جما لیتا۔ وہ تقریباً تین بج کر پچپن یا چھپن منٹ پر روزانہ سڑک پر نمودار ہوتی، سر جھکائے ہوئے، کندھے پر بیگ لٹکائے ہوئے۔ میری بے چینی اور بڑھ جاتی، وہ خاموشی سے میرے پاس سے گزر جاتی، میں اُس سے نگاہ نیچے کئے ہوئے دل کی آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا، میرے ہونٹ اور میری زبان میرا ساتھ نہ دیتے۔ اور وہ اعتماد کے ساتھ بناء کسی جھجک کے خاموشی کے ساتھ چلتی ہوئی، میرے بائیں ہاتھ کی طرف اپنے گھر جو کہ مسجد کے قریب تھا، گزر جاتی۔ مگر جب سڑک کا موڑ آتا تو وہ مڑنے سے پہلے ایک دفعہ میری طرف مڑ کر ضرور دیکھتی، گو کہ میرے اور اُس کے درمیان تقریباً دس پندرہ گز کا فاصلہ ہوتا پھر بھی ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے کا تعاقب کرتیں۔ مجھے سکون آجاتا اور وہ اپنے گھر روانہ ہو جاتی۔

یہ سلسلہ کوئی تین ساڑھے تین برس تک یوں ہی چلتا رہا، سردیوں میں اُس کا ٹائم تین پینتالیس سے لے کر چار بجے سہ پہر تک کا تھا، گرمیوں کے موسم میں اُس کا ٹائم چار بج کے پندرہ منٹ سے لے کر سہ پہر چار بج کر پچیس چھبیس منٹ تک کا ہوتا۔ یہ ایک عجیب سلسلہ تھا روز یہ وقت قریب آتا تو میں پاگلوں کی طرح بے چین ہو جاتا بھلے سخت گرمی ہوتی یا شدید سردیوں کی بارش ہو رہی ہوتی میں نے اپنی حاضری لگوانی ہوتی تھی۔ یہ خاموش محبت جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تین ساڑھے تین برس تک بناء ایک لفظ بولے چلتی رہی۔ اس دوران میں ویل چیئر چھوڑ کر بیساکھیوں پر آ گیا تھا میری حاضری کے ٹائم میں کبھی تاخیر ہوتی نہ غیر حاضری، ہاں کبھی کبھی جب وہ چھٹی کرتی آفس سے تو اُس دن میرا دن بڑا بے چین گزرتا کیونکہ میں افسردہ ہو جاتا۔

ہم دوستوں نے روز کا معمول بنا لیا تھا کہ اپنے گھر کے سامنے سڑک کے درمیان ٹینس بال کے

ساتھ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ یہ ایک بہانہ تھا اُس کو دیکھنے کا اور یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے اُس سے کتنا دلی لگاؤ ہے۔ محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی یہ میرا ایمان تھا اور میں بڑی شدت کے ساتھ اُس سے محبت کرتا تھا۔ اِس خاموش محبت کا پتا میرے چند قریبی دوستوں کو بھی تھا جب وہ سڑک پر نمودار ہوتی تو میرے دوست ایک دوسرے سے ہلکی سی آواز میں بات کرتے اور کہتے ''اوئے سوکو'' آرہی ہے۔ سوکو اُسے اس لئے کہتے کہ وہ نہایت کمزور، باریک نازک بدن والی میچیور لڑکی تھی جو کہ ایک سرکاری ادارے میں ملازمت کررہی تھی۔ اُس کے دو بھائی اور ایک بہن تھی، باپ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھا، بڑا بھائی سعودیہ میں کسی غیر ملکی کمپنی میں کام کرتا تھا، چھوٹا بھائی پی ٹی سی ایل میں آپریٹر تھا، اُس کی چھوٹی بہن قائداعظم یونیورسٹی میں مطالعہ پاکستان میں ایم ایس سی کررہی تھی، والدہ اُس کی اکثر بیمار رہا کرتی تھیں۔

یہ ساری معلومات میں نے بڑی خفیہ طریقے سے اُس کے گھر کے ساتھ رہنے والے ایک بچے عرفان سے حاصل کی تھیں جو کہ اُس وقت ساتویں کلاس کا طالب علم تھا اور وہ بھی روزانہ ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے شوق میں سڑک پر آجایا کرتا تھا۔ میں ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے ایک ٹانگ سے معذور ہو چکا تھا، بیساکھیوں پر آگیا اور پرائیویٹ پڑھائی شروع کردی کیونکہ ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے میری پڑھائی ادھوری رہ گئی تھی۔ میرے تمام دوست جو کہ میرے ہم عمر تھے کوئی ڈبل میتھ، فزکس میں بی ایس سی کررہا تھا اور کوئی فائن آرٹس میں گریجویشن۔ میرے پاس اِن سب سے زیادہ نالج تھا مگر میرے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی جب بھی ہم تمام دوست اکٹھے کہیں بیٹھتے یا کسی پارٹی پر جاتے تو ہر لڑکا اپنا تعارف، اپنی تعلیم کے حوالے سے کرواتا، مگر جب میری باری آتی تو میں خاموش ہو جاتا کیونکہ میں اُس وقت تک پرائمری پاس تھا۔

مجھے اِس بات نے بہت زیادہ اندر سے تحریک دی کہ فراز صاحب اب آپ کو بھی تعلیم حاصل کرنی پڑے گی،. کاغذ کا ایک ٹکڑا، جسے لوگ ڈگری کہتے ہیں وہ اپنی زندگی میں حاصل کرنا پڑے گا اگر اپنے محبوب تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ چنانچہ میں نے پرائیویٹ میٹرک پاس کیا، اس دوران میرا اور ذکیہ کا خاموش عشق یونہی چلتا رہا۔ میں ایک دن ایف اے کا پیپر دے کر جلدی جلدی واپس

گھر آرہا تھا، گرمیوں کے دن تھے اور میرا پیپر سیکنڈ شفٹ میں تھا، میرا Examination Center اسلامیہ ہائی سکول لیاقت باغ نزد مری روڈ پر بنا تھا۔ پیپر ایک بجے شروع ہوتا اور تقریباً ساڑھے چار بجے تک چلتا مگر میرا اصل پیپر تو ذکیہ کا دیدار تھا۔ میں اپنا ہر پیپر وقت مقررہ سے پہلے حل کر کے ممتحن کو دے دیتا اپنی بیساکھیاں اُٹھاتا کالج کے یار محمد شیر پاؤ ہال سے نکل کر مری روڈ کراس کرتا اور لیاقت باغ سٹاپ پر کھڑا ہو جاتا۔ اُن دنوں مزدہ بسیں جی پی او راولپنڈی سے شاہین چوک اسلام آباد سے چلا کرتی تھی، میں کسی بھی مزدہ ڈبے میں بیٹھ جاتا پھر صادق آباد سٹاپ سے اُتر کر مری روڈ کراس کرتا اور اپنے گھر کی طرف چراہ روڈ کی طرف پیدل چلنے لگ پڑتا۔ میری کوشش ہوتی کہ اپنے محبوب کا دیدار مس نہ کروں، ایک دن اسی طرح میں اسلامیات کا پیپر دے کر، بیساکھیاں پکڑے اپنی طرف سے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چل رہا تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

جب میں عرشی مسجد کے چوک کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ذکیہ مورث ٹیکسی میں بیٹھی ج رہی ہے، میرا دل تڑک سے ٹوٹ گیا آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنے چلنے کی رفتار آہستہ کرلی۔ سر نیچے کئے ہوئے میں اپنے گھر کی طرف چلتا رہا ابھی میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا، وہ مردانہ آواز تھی، اُس نے پھر پکارا، او باؤ جی گل سنو۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دل سے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک مورث ٹیکسی کھڑی تھی اور ڈرائیور مجھے کہہ رہا تھا، باؤ جی یہ بی بی آپ کو بلا رہی ہیں،۔ سخت گرمیوں کے دن تھے میرے کپڑے پسینے سے شرابور ہو چکے تھے کچھ ذکیہ کو نہ دیکھنے کا غم تھا۔ میں حیران پریشان آہستہ آہستہ ٹیکسی کے قریب پہنچا اور پچھلے دروازے کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا، جی آپ نے مجھے بلایا، تو اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا، آیئے آپ گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ جایئے میں آپ کو گھر اُتار دیتی ہوں۔ میں نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے گھر کا فاصلہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا، مگر جی چاہ رہا تھا کہ یہ فاصلہ کبھی ختم نہ ہو میں ذکیہ کے ساتھ اسی طرح بیٹھا رہوں، میرے اندر کی بے چینی اور گھبراہٹ صاف نظر آرہی تھی مگر وہ بڑی پر اعتماد تھی، اُس نے پوچھا، کہاں سے آرہے ہیں آپ؟ گو کہ میں ایف اے اسلامیات کا پیپر دے کر آرہا تھا، مگر میں نے اُس سے جھوٹ بولا،

کہ جی میں گریجویشن کر رہا ہوں اور آج میرا پیپر تھا۔

کہتے ہیں جنگ اور عشق میں سب جائز ہوتا ہے، اتنی بات ابھی ہوئی تھی کہ میرا گھر قریب آ گیا مگر میں اپنے گھر کے پاس نہیں اُترا اور ذکیہ سے پوچھا، آپ کہاں کام کرتی ہیں؟ اُس نے مسکرا کر کہا، میں (PIDE) میں کام کرتی ہوں۔ گاڑی میرے گھر سے آگے گزر گئی اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈرائیور کو کہا، گاڑی روکیں میرا گھر آ گیا ہے۔ ذکیہ نے مسکرا کر کہا، گھر تو آپ کا گزر گیا ہے۔ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا، جی۔ پھر ڈرائیور نے گاڑی روکی، جب میں اترنے لگا تو ذکیہ نے کہا، آپ آرام سے دھیان سے اُتریئے کوئی جلدی نہیں ہے۔

اُس دن مجھے پتا چلا کہ ذکیہ صادق آباد سٹاپ سے روزانہ پیدل چل کر میرے گھر سے ہوتی ہوئی اپنے گھر جاتی ہے، اُس دن شاید گرمی کی شدت تھی یا میرے عشق کے جنون میں جوار بھاٹا آیا ہوا تھا جس کی بناء پر ہم دونوں میں یہ پہلی باآواز ملاقات تھی۔ پھر روزانہ جب وہ میرے گھر کے باہر سے گزرتی تو ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوتیں، ہم آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے سلام دُعا کر لیا کرتے۔ یہ سلسلہ مزید چھ ماہ اور اسی طرح چلتا رہا پھر ہمارے گھر میں میری بہن کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، ایک دن اُسے میں نے راستے میں ہی پوچھا، میری بہن کی شادی آ رہی ہے، آپ کو شادی کا کارڈ دینے گھر آ جاؤں تو اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے بناء کچھ بولے حامی بھر لی۔ گرمیوں میں وہ خوبصورت لان کے پرنٹڈ شلوار قمیص پہنتی اور سردیوں میں اپنے کمزور بدن کو ڈھانپنے کے لئے کبھی سوئیٹر اور کبھی لیڈیز جیکٹ زیب تن کیا کرتی تھی۔

اُن دنوں موبائل تھا نہ کوئی اور رابطے کا ذریعہ، میرے پاس واحد ایک ذریعہ ذکیہ کا ہمسایہ عرفان تھا جس سے میں نے اُس کے گھر کے بارے میں تمام ملاقات باتوں باتوں میں اکٹھی کر لی تھی، پھر میں ایک دن بیساکھیاں پکڑے ہوئے اُس کے گھر کے باہر کھڑا دستک دے رہا تھا میرے ہاتھ میں میری بہن کی شادی کا کارڈ تھا۔ جب میں نے دستک دی تو اُس کا چھوٹا بھائی آصف گھر سے باہر نکلا وہ مجھے جانتا تھا، میری اُس کی سلام دُعا ہوئی، اُس نے پوچھا فراز کیسے آئے ہو؟ میں نے کہا یار میری بہن کی شادی ہے، کارڈ دینے آیا ہوں، وہ مجھے اندر لے گیا، اندر کمرے میں اُس کے والد

اور والدہ تھے جو بڑے پیار سے ملے، ذکیہ کے والد سے بھی میرا پہلے سے تعارف تھا کیونکہ میں جمعے کے جمعے نماز پڑھنے مسجد جایا کرتا۔ پوچھنے لگے فراز کیسے آنا ہوا؟ میں نے کہا، جی یہ میری بہن کی شادی کا کارڈ ہے۔

اتنے میں ذکیہ بڑے سادے سے کپڑوں میں ملبوس سر پر دوپٹہ لئے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے روح افزاء کا ایک گلاس پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا، جو میں نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھا کر ایک ہی سانس میں پی لیا۔ چند منٹ میں وہاں بیٹھا پھر علاؤ الدین صاحب اور آصف سے اجازت لے کر بڑی سرشاری کے عالم میں گھر واپس آ گیا۔

ایک ہفتے کے بعد میری بہن کی شادی شروع ہوگئی، ہم لوگوں نے سڑک پر ٹینٹ لگا کر شادی کا اہتمام کیا تھا ذکیہ اُن دنوں میرے گھر کے قریب سے ٹینٹ کے پیچھے سے ہوتے ہوئے گھر جایا کرتی تھی۔ میری بہن کی مہندی کی شام گزر چکی تھی، اگلے دن بارات آنی تھی، بارات بھی آ کر چلی گئی مگر ذکیہ کے گھر سے کوئی بھی میری بہن کی شادی میں شریک نہ ہوا۔ مجھے بہت سخت ملال اور دکھ ہوا، جب شادی ختم ہوگئی تو میں اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا، وہی سہ پہر کے ساڑھے تین پونے چار، اور وہی آوازیں میرے دوستوں کی طرف سے "اوئے سوکو" آ رہی ہے اوئے بال نہیں کرانا اُسے گزر جانے دینا"

ایک دن میں اکیلا اُس کے انتظار میں تھا کوئی کرکٹ نہیں کھیل رہا تھا، ذکیہ میرے پاس سے گزر رہی تھی، میں نے اُس سے گلہ کرتے ہوئے کہا آپ میری بہن کی شادی پر نہیں آئیں۔ ذکیہ نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا، کارڈ پر آپ نے نام صرف آصف کا لکھا ہوا تھا میں بھلا کیسے آ سکتی تھی۔ یہ بات کر کے وہ مجھے ریزہ ریزہ کر گئی تھی میں اپنی نادانی اور کم عقلی پر شرمندہ ہو گیا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد مجھے عرفان نے بتایا کہ فراز بھائی ذکیہ باجی کی شادی طے ہوگئی ہے۔۔۔ مجھے دن میں تارے نظر آنے لگ پڑے۔۔۔۔۔۔ اور فیض صاحب کی ایک نظم میرے ذہن میں گونجنے لگی

آؤ کہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

تماشہ

موسم تبدیل ہو رہا تھا، گرمی اپنا آخری زور دکھا رہی تھی، بھادوں کا موسم عروج پر تھا، آپ کو پتا ہے کہ ساون اور بھادوں میں یہ خصوصیت ہے کہ بارش بہت ہوتی ہے مگر ساون کی بارش تھوڑی دیر کے لئے بہت ہوتی ہے، پھر ختم ہو جاتی ہے۔ جب ختم ہوتی ہے تو حبس بڑھ جاتا ہے، اور جب حبس بڑھتا ہے تو دل کو گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ مگر بھادوں کی بارش ساون کی بارش سے بالکل مختلف ہے یہ بہت زیادہ ہوتی ہے، تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان سے پرنالے بہہ رہے ہیں، اور بقول شاعر

برکھا ہے یہ بھادوں کی برسے تو بڑی برسے

وقت نے واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا، دِن روزانہ ایک ایک منٹ چھوٹا ہو رہا تھا، مغرب جو پہلے ساڑھے سات تک چلی گئی تھی اب شام چھ بج کر پندرہ منٹ پر شروع ہو رہی تھی فجر کی اذان بھی اب صبح پانچ بجے تک پہنچ چکی تھی۔ روز زندگی صبح پرندوں کے چہچہانے سے شروع ہوتی، گھروں میں مائیں صبح چھ بجے اُٹھ جاتیں، سات سوا سات بجے بچوں کے سکول کی وین آجاتی اور بچے سکول کالج کے لئے روانہ ہو جاتے۔ آٹھ بجے بچوں کے باپ آفس کے لئے نکل پڑتے اور بچوں کی ماں گھر میں اکیلی رہ جاتی۔ یہ روٹین گزارتے ہوئے مجھے تیس برس ہو گئے اِن تیس برسوں میں میں نے اپنے بہت سے پیارے کھو دیئے کیونکہ اُن کی زندگی مکمل ہو چکی تھی۔ اِن مین میرے ماں باپ میرا بھائی، میرے دوست احباب میرے دفتر کے کولیگ، میرے بچپن کے ساتھی۔ جب کبھی میں تیس برس پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میں ہی تنہا اکیلا بچا ہوں اور نا جانے کس وقت کس لمحے، کون سا ایسا دن ہو گا مہینہ ہو گا، تاریخ ہو گی جب میرا بھی اعلان کیا جائے گا کہ طارق رشید ولد محمد رشید رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں اور اُن کا نمازِ جنازہ بعد از نمازِ عصر اُن کے گھر سے اُٹھایا جائے گا۔ کچھ لوگوں کو سمجھ آئے گی، کچھ لوگوں کو پتا نہیں چل سکے گا۔

ابھی میں یہ باتیں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں احسن کے گھر پہنچ گیا، احسن کو دیکھا تو اُسے پہچان نہ سکا میں نے اُس سے پوچھا، احسن یہ کیا حالت تم نے اپنی بنائی ہوئی ہے، یار تم تو نوجوان ہو میرے سے بہت چھوٹے ہو عمر میں۔ تو احسن کے چہرے پر ایک دردناک مسکراہٹ پھیل گئی، کہنے لگا، میرا باپ مر گیا ہے۔ میں نے کہا، یار تو نے بتایا ہی نہیں۔ بولا، تم شہر میں نہیں تھے اُسے مرے چھ ماہ ہو گئے۔ میں نے کہا، احسن یار پر تیری ماں تیری بہن تو ہے تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے رنگ پیلا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، ہونٹ سگریٹ پی پی کر سیاہی مائل ہو چکے، بدن کمزور اور پتلے پتلے بازوؤں میں احسن نے ربڑ کا بینڈ پہنا ہوا تھا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا احسن تو کوئی نشہ تو نہیں کرتا؟ اُس نے میری بات کاٹ دی اور بولنا شروع کر دیا، کہنے لگا، یار طارق میری سوتیلی ماں میرے باپ کے فوت ہونے کے تین دن بعد گھر چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی کیونکہ میں اُس کے لئے نامحرم تھا۔ بولی، میں اپنی عدت کے دن میکے میں پورے کروں گی۔ گھر میں میرے ساتھ صرف میری بہن رہ گئی جو کہ مجھ سے ایک سال چھوٹی ہے، مگر طارق تجھے پتا ہے نہ کہ وہ بچپن سے ہی بیمار ہے اُسے مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ میں نے کچھ دن تو اُس کو برداشت کیا، پھر میں اُس سے تنگ آ گیا، میں نے اُسے ایک دن خوب مارا اور اپنی پھوپھو کے گھر چھوڑ آیا، اب گھر میں میں اکیلا رہتا ہوں، میرے ساتھ دو کتے ہیں اور میری ذات ہے۔ میں نے احسن سے پوچھا، کھانا پینا اور اپنی گزر بسر کیسے کرتا ہے؟ اُس نے کہا، روزانہ کوئی نہ کوئی ہمسایہ مجھے دو وقت کا کھانا دے دیتا ہے، جیب خرچ کے لئے ہر پندرہ دن کے بعد میری پھوپھو پانچ ہزار روپیہ اپنے محلے کے ایک دکاندار نذیر صاحب کی دکان پر بھجوا دیتی ہیں اور مجھے فون کر کے کہتی ہیں نذیر صاحب کی دکان سے پیسے لے جاؤ۔ جب مزید 14 دن گزرتے ہیں تو میں پھوپھو کو فون کرتا ہوں کہ پیسے چاہییں اور پھر وہ پیسے بھیج دیتی ہیں۔ میں نے احسن سے پوچھا، کیا تم اپنی پھوپھو کے گھر نہیں جا سکتے، کیا اُنھوں نے تمھیں منع کر رکھا ہے؟ تو اُس نے کہا ہاں، کیونکہ جب میرا باپ زندہ تھا تو میں اپنے باپ کو مارا پیٹا کرتا تھا، میرے باپ کا منہ میرے تھپڑوں سے سرخ ہو جاتا تھا۔ میں نے احسن کو کہا، یار تو بڑا ظالم انسان ہے ایسی حرکتیں کیوں کرتا

تھا؟ احسن نے بتایا میرے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے میرا باپ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھا، جب وہ پہلی کے پہلی اپنی پینشن لے کر آتا تو میں دروازے پر اُس کا انتظار کرتا، اُس کی جیب سے آٹھ ہزار روپیہ چھین لیا کرتا وہ آٹھ ہزار میں دو چار دنوں میں ختم کر دیتا تھا، پھر ہمارے گھر جھگڑے شروع ہو جاتے تھے کیونکہ میں باپ سے پیسوں کا مطالبہ کرتا تھا، مگر میرے باپ کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے اس بات پر میں اپنے باپ کا گریبان پکڑ لیتا، گندی گندی گالیاں نکالتا، اونچا بولتا محلے والے اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

یہ سلسلہ چھ ماہ ہوئے بند ہو چکا ہے کیونکہ میرا باپ کورونا کا شکار ہو گیا، میں جس گھر میں رہتا ہوں وہ میرے دادا کے نام ہے، میں نے اپنی پھوپھی سے مطالبہ کیا ہے کہ گھر بیچ کر مجھے میرے باپ کا حصہ دیا جائے، سوتیلی ماں نے بھی اپنا شرعی حق مانگ لیا ہے۔ اب یہ گھر جس میں، میں تن تنہا رہ رہا ہوں کچھ دنوں میں بک جائے گا مجھے باپ کے حصے میں سے لاکھوں روپے ملیں گے اور میں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ ملک سے باہر چلا جاؤں گا، کیونکہ مجھے میرے خاندان والے میری بہنیں، میرا ددھیال پسند نہیں کرتے۔ میں نے احسن کی طرف غور سے دیکھا اور کہا، یار تو کس کام میں پڑ گیا ہے، ارے پگلے اپنے آبائی گھر کو بیچ کر تو بے گھر ہو جائے گا سڑک پر آ جائے گا، دُنیا بڑی ظالم ہے، تجھ سے تیرے پیسے چھین لے گی، کوئی فراڈ کر جائے گا تیرے ساتھ، مجھے شک پڑتا ہے کہ تو یہ پیسہ شاید نشے میں اُڑا دیگا، کیونکہ جیسے تیری حالت نظر آ رہی ہے یہ ایک صحت مند انسان کی حالت نہیں لگتی۔ احسن نے سر جھکا لیا آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو آ گئے، میں نے اُسے گلے سے لگایا مگر مجھے اُس کے بدن سے نفرت کی بو آ رہی تھی اپنے رشتے داروں سے، اپنے محلے والوں سے، اپنی بہنوں سے، اُس کی نس نس میں زہر بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں نے کسی سانپ کو گلے لگا لیا ہو۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں وہ مجھے ڈس نہ لے۔

یہ وہی احسن تھا، میرے سامنے بڑا ہوا اسکول جانے لگا، باپ اور ماں اس کی ہر خواہش ہر ضد پوری کیا کرتے تھے، پھر اچانک احسن کی ماں 24 برس پہلے فوت ہو گئیں اور اس کے باپ نے بیس برس پہلے دوسری شادی کر لی۔ احسن اور اُس کی بہنوں نے سوتیلی ماں کو قبول نہ کیا، تب یہ

لوگ پرائمری کلاسوں میں پڑھا کرتے تھے، مگر اِن کا اپنی سوتیلی ماں سے روزانہ جھگڑا ہوا کرتا تھا، کبھی سکول جاتے ہوئے ناشتے پر، کبھی دوپہر کو سکول سے آکر دوپہر کے کھانے پر، روزانہ 24 گھنٹے میں 16 گھنٹے گھر میں بک بک چخ چخ ہوا کرتی۔ باپ تنگ آکر احسن کو ڈنڈوں سے مارا کرتا تھا، احسن مار کھا کھا کر ڈھیٹ ہو چکا تھا اُس نے ساتویں کلاس کے بعد سکول بھی چھوڑ دیا تھا، آج احسن میرے سامنے 33 برس کا جوان کھڑا تھا مگر چہرے سے وہ ایک لاغر مجبور اور بے بس انسان نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا احسن شادی کر لیتے۔ کہنے لگا، مجھے کون لڑکی دے گا؟ میں نے چلا کر کہا، یار کہیں سیلزمینی کر لیتا کوئی نوکری کر لیتا، تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا، تم نے تو اپنا آپ تباہ کر لیا اپنے دادا کا نام ڈبو دیا اپنے باپ کو اتنی تکالیف دیں، یار تو کیسا انسان ہے، مجھے تو تجھ سے گھن آرہی ہے۔ احسن پھر بدتمیزی پر اُتر آیا مجھے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں اور کہنے لگا آیا تو بڑا نواب، تو اپنے گھر میں خوش ہے نا، تیرے پاس تو دُنیا کی ہر آسائش ہے، میری مفلسی اور غربت کا مذاق اُڑاتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی۔ اُلٹا احسن نے مجھے بے عزت کر دیا، اتنے میں احسن کا ایک محلے دار اپنے گھر سے باہر آگیا، اور اُس نے میرے ہاتھ تھام کر کہا کہ آئیں بھائی صاحب چلیں، بچہ ہے دکھی ہے بات یہ بھی سچ کر رہا ہے، بات آپ نے بھی غلط نہیں کی مگر یہ زندگی بڑی ظالم ہے۔ کبھی یہ ہنساتی ہے اور کبھی رُلاتی ہے۔ میں نے اُس ہمسائے کا شکریہ ادا کیا کیونکہ عشاء کی اذان ہو رہی تھی اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ میں احسن کے محلے سے باہر نکل آیا اور سوچ میں پڑ گیا، صبح سوموار تھی، ایک نئے دن کا آغاز نئے ہفتے کی شروعات، پھر منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ اتوار، چار ہفتے، مہینے کے بارہ ماہ، سردیوں کا آغاز، زرد پتوں کی سرسراہٹ درختوں کا بے لباس ہونا، پھر بہار میں پھولوں کا کھلنا، نئی کونپلیں، پھل لگنا، بچوں کے امتحان شروع ہو جانے، پھر رزلٹ آنا 31 مارچ کو، نئی کلاسیں، نیا بستہ، نئی آرزوئیں، پھر گرمیوں کا آنا، بجلی کی لوڈشیڈنگ انسانوں کا مرنا، نئے بچوں کا پیدا ہونا۔ یہ کیا کون سا جنگل ہے، جس میں بے تحاشا خواہشوں کے گھنے درخت لگے ہوئے ہیں، اور اُن درختوں پر بے شمار خواہشیں کے پھل لٹک رہے ہیں جو کہ ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتے، میں زندگی کے اس جنگل میں کھو گیا اور آج تک لاپتا ہوں، کوئی ہے جو مجھے تلاش کر لے۔۔۔۔۔۔

طوائف

ہمیں سمندری (لائل پور) سے آئے ہوئے کوئی مہینہ ہوا تھا اُس وقت میری عمر ساڑھے چار برس کی تھی، ابا سمندری میں انسپکٹر ڈاک خانہ جات تھے ہم لوگ بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم پانچ بہن بھائی تھے، بڑا بھائی 19 برس کا تھا، اُس کے بعد ایک بھائی تھا پھر تین بہنیں تھیں سب سے چھوٹا میں تھا مجھے گھر میں لاڈلہ کہا جاتا تھا اور کبھی کبھی ''ٹڈ گرڑوڑی'' بھی کہا جاتا تھا، میں بڑا خوش تھا کوئی فکر اور غم نہیں تھا بہت پیاری زندگی تھی۔

1965ء میں میرے بھائی کا داخلہ پولی ٹیکنیکل کالج راولپنڈی میں ہو گیا جو کہ پشاور روڈ راولپنڈی میں واقع تھا اُس کو ہاسٹل میں رہنا پسند نہیں تھا میری ماں کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کا بیٹا ہاسٹ میں رہے اور باہر کا کھانا کھائے۔ یہ مسئلہ حل کرنے کیلئے میرے باپ نے اپنی ٹرانسفر سمندری سے جو کہ لائل پور کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا (فیصل آباد) وہاں سے جی پی او راولپنڈی میں کروالی۔ ٹرانسفر کروانے میں میرے باپ کی Seniority پر اثر پڑا اور وہ راولپنڈی جی پی او میں Most Junior Seniortiy List میں آگئے جس کی وجہ سے اُن کی پروموشن پر بہت زیادہ اثر پڑا مگر انھوں نے اس چیز کا احساس گھر والوں کو نہیں ہونے دیا۔ ابھی مہینہ ہی ہوا تھا ہمیں راولپنڈی میں آئے ہوئے مئی 1965ء کے دن تھے ہم نے ایک مکان کرائے پر لیا جو کہ پیر چوہا محلہ میں واقعہ تھا، بند گلی تھی ساتھ ہمسائے تھے ہمارا اور اُن کا پانی استعمال کرنے کا کنواں مشترکہ تھا۔

ہمسایوں کے گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، شادی نعیم کی تھی نعیم ایک اچھا خوبصورت نوجوان تھا ہم نئے نئے محلے میں آئے تھے، نعیم کے بڑے بھائی ہمارے گھر آئے، دروازے پر دستک دی میں بھاگتا بھاگتا دروازے پر گیا۔ دروازہ سارا دن کھلا رہتا تھا اُس پر پردے کے طور پر ایک ٹاٹ ٹنگا رہتا تھا جسے ہم پکڑ کر کبھی کبھی جھولا بھی لیا کرتے تھے جب میں باہر گیا تو نعیم کے بڑے بھائی کھڑے تھے اُن کے ہاتھ میں شادی کا کارڈ تھا۔ انھوں نے مجھے پیار کیا اور کہا، بیٹا ابو کہاں ہیں؟ میں نے کہا، ابو تو دفتر گئے ہوئے ہیں۔ وہ ہنس پڑے اور مجھے کارڈ دیتے ہوئے کہا

بیٹا یہ شادی کا کارڈ ہے اور آپ سب نے آنا ہے ابو کو بتا دینا۔

مجھے کارڈ پڑھنا نہیں آتا تھا میں بغیر کچھ کہے اندر بھاگ آیا۔ ماں کو بتایا، اماں یہ ساتھ والے ہمسائے شادی کا کارڈ دے گئے ہیں۔ ماں نے مجھ سے کارڈ لیا اور شادی کا پروگرام پڑھنا شروع کر دیا اُس میں مہندی تھی، بارات کے لئے دو بندے اور ولیمے میں سارے گھر والوں کو بلایا گیا تھا۔ دو دن بعد شادی تھی مہندی سے ایک دن پہلے ابو نے کہا، نعیم نے اپنے گھر موسیقی کا پروگرام رکھا ہے گانے والے آئیں گے، میں نے ضد کی کہ ابو جی میں نے بھی جانا ہے۔

اگلی رات شام کو کھانے کے بعد ابو اور میں موسیقی کا پروگرام دیکھنے نعیم کے گھر چلے گئے وہ میری زندگی کا پہلا لائیو موسیقی کا پروگرام تھا۔ ایک طرف ڈھولکی والا بیٹھا تھا ایک طرف ہارمونیم جسے لوگ اکثر پیٹی بھی کہتے ہیں اور ایک بہت ہی نازک اندام خوبصورت سی لڑکی پاؤں میں گھنگھروں باندھ رہی تھی۔ ہارمونیم اور ڈھولکی والا اپنے سُر درست کر رہے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے اُن دنوں فلم ''نائلہ'' ریلیز ہو چکی تھی اور مالا بیگم کے مشہور گائے گانے ہر طرف زبان زد عام تھے اُس لڑکی نے پہلا گانا ہی فلم ''نائلہ'' کا گایا جس کے بول تھے ''غمِ دل کو اِن آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے تڑپنا بھی ہمیں آتا ہے تڑپانا بھی آتا ہے'' میں اپنے باپ کے آگے بیٹھا ہوا تھا وہ لڑکی کبھی کبھی میرے قریب آ کر میری ناک پر اپنی انگلی رکھتی جس کا لمس ابھی تک مجھے محسوس ہوتا ہے تو میرے کان سرخ ہو جاتے اور میں آنکھیں نیچی کر لیتا۔

مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لوگ اُس لڑکی پر نوٹ پھینک رہے تھے ایک ایک روپے کے دو دو روپے کے، جن کے پاس زیادہ پیسے تھے وہ پانچ روپے کا نوٹ بھی پھینکتے تھے کبھی کوئی دوست اُٹھ کر نعیم کی گال پر نوٹ رکھ دیتا تو وہ نازک اندام لڑکی اپنی اداؤں سے لہراتے ہوئے نعیم کی گال سے وہ نوٹ اُچک لیتی۔ وہ رات کافی دیر تک موسیقی میں ڈوبی رہی مجھے نہیں پتا کہ ہم کس وقت وہاں سے گھر آئے۔ پھر کافی عرصہ بیت گیا وہ لڑکی، ڈانس اور اُس کی ادائیں میں کبھی نہ بھول سکا پھر ہم لوگوں نے وہاں سے مکان شفٹ کیا اور راولپنڈی کے ایک پوش ایریا میں مکان لے لیا۔ وہاں میری دوستی عابد سے ہو گئی عابد کیمسٹ تھا اُس کی دوائیوں کی دُکان تھی ہم اُسے بڑا تنگ

کرتے مذاق کرتے۔ کبھی کبھی وہ ہمیں ڈانٹ دیتا اور کبھی کبھی اپنی دُکان پر بٹھا کر گھر چلا جاتا اور کہتا کوئی آئے تو اُسے یہ دوائی دے دینا۔ کھانسی کی دوائی یہ ہے اور پیٹ خراب ہو تو اُس کے لئے یہ Entox کی گولیاں ہے یہ دے دینا۔ دراز میں کچھ ڈبیاں پڑی ہوتی تھیں وہ کہتا اگر کوئی عورت یا آدمی آئے اور وہ ''ساتھی'' مانگے تو اُسے یہ نکال کر دے دینا ہم اُسے کھول کر دیکھتے، نام لکھا ہوتا ''ساتھی'' اُس میں تین عدد ربڑ ٹائپ کی کوئی چیز پیک ہوتی تھی۔

عابد کی دکان پر میری دوستی ناصر سے ہوگئی ایک دن ناصر اپنی شادی کا کارڈ لے آیا کہ یار میری شادی ہو رہی ہے تم نے سب دوستوں نے آنا ہے مہندی والی رات گانے کا پروگرام بھی ہوگا۔ ہم لوگ بڑے خوش ہوئے کہ چل یار مجرا دیکھیں گے اور ہم نے مجرے کے لئے ویلے جمع کرنی شروع کر دیں۔ جو ہمیں روزمرہ کا جیب خرچ ملتا تھا وہ ہم نے بچانا شروع کر دیا مہندی والی رات تک ہمارے پاس دو سو روپے کے روپے روپے اور دو دو روپے کے نوٹ جمع ہو چکے تھے۔ مجرا جہاں ہونا تھا وہ بہت امیر پٹھان تھا ناصر کے بڑے بھائی کا دوست اور اُس کا کاروباری شراکت دار بھی تھا۔ ہم لوگ رات ساڑھے دس بجے ناصر کے ساتھ اُس پٹھان کے گھر چلے گئے وہاں ایک بڑا ہال تھا جس پر قالین بچھے ہوئے تھے، ایک طبلے والا بیٹھا ہوا تھا اپنے طبلے کے سُر لوہے کی چھوٹی سی ہتھوڑی کے ساتھ صحیح کر رہا تھا، ہارمونیم پر ایک بندہ تھا وہ بھی اپنے سُر درست کر رہا تھا،

جب ہم سارے دوست کمرے کے اندر داخل ہوئے ہم سب بیس بائیس برس کے جوان تھے ہمارے آگے آگے خالد تھا جب وہ اندر داخل ہوا تو گانے والی نے اُسے دیکھتے ہی کہا، (اے تے جاوید شیخ لگدا اے)۔ جب ہم نے گانے والی کی طرف دیکھا تو وہ ایک مشہور فلم سٹار تھی اُس نے گانا شروع کیا جب گانا شروع ہوا تو وہاں بیٹھے لوگوں نے ویلیں دینا شروع کیں جو سب سے پہلی ویل آئی وہ ایک پٹھان کی تھی انہوں نے پانچ سو کا نوٹ نکالا، پھر یہ سلسلہ بڑھتا گیا کسی نے ہزار کے نوٹ پھینکے کسی نے پچاس پچاس کی گڈی اُس کے سر پر پھینکی۔ ہم لوگ سمجھ رہے تھے کہ کوئی عام طوائف مجرا کرنے آرہی ہے ہم نے جو اپنے دو سو روپے جیب میں رکھے تھے وہ جیب میں ہی رہنے دیئے کیونکہ وہاں پر پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی ریگل شواز کھلی چل رہی تھی

ہم سب حیران ہو رہے تھے، میں خود کو بڑا بے بس محسوس کر رہا تھا کہ ایک عورت دس پندرہ لوگوں کے بیچ میں ناچ رہی ہے میرے اندر کا انسان مجھے ملامت کر رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

میں اسی گومگو کی حالت میں بیٹھا تھا کہ دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے رات ایک بجے کھانے کا وقفہ ہوا جس میں بار بی کیو، چکن تکہ، مٹن تکہ، نان چٹنی سلاد وغیرہ سرو کیا گیا۔ اُس کے بعد پھر گانا شروع ہو گیا وہ فلم سٹار فجر کی اذان تک ناچتی رہی اور گانے گاتی رہی، جب اذان ہوئی تو اُس نے ایک دم سے سازندوں سے کہا بس اب گانا ختم، اب میں مزید نہیں گاؤں گی کیونکہ اذان ہو گئی ہے۔ میں بھاری دل اور بھاری قدموں سے فجر کے وقت وہاں سے نکلا، نہ شراب پی نا نماز پڑھی، چپکے سے آ کر اپنے کمرے میں سو گیا۔

تیسری دفعہ مجھے مجرا دیکھنے کا موقع اپنے ایک اور دوست کے ساتھ ملا، اُس نے کہا، سعید یار آج چلنا ہے بحریہ ٹاؤن۔ میں تھوڑا ایسے کاموں سے اجتناب کرتا تھا گو کہ میں کوئی پکا مسلمان بھی نہیں تھا، عام دنیادار تھا۔ لیکن میرے دوست نے اصرار کیا کہ یار چلنا ہے، میں تھوڑا ڈر رہا تھا، نہیں یار میں نہیں جا سکتا۔ تو اُس نے کہا اکٹھے جائیں گے تم تیار رہنا میں تمھیں لینے آ جاؤں گا۔ رات دس بجے ہم لوگ بحریہ ٹاؤن چلے گئے، وہاں پر ایک بہت بڑی کوٹھی تھی گاڑیاں ہم نے کوٹھی کے باہر پارک کیں پھر ہمیں اُس کوٹھی کے بیسمنٹ میں لے جایا گیا جہاں پر تین چار لڑکیاں ڈسکو لائٹس میں پہلے سے ڈانس کر رہی تھیں۔ میں بھی وہاں جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا، دوست نے میرا تعارف کروایا، وہاں پر بھی شراب کا انتظام تھا ساتھ میں چپس اور دال وغیرہ پڑی ہوئی تھی، مجھے بھی آدھا گلاس شراب دی گئی میں نے آج تک پی نہیں تھی مگر دوست نے کہا کہ یار آج پی لے، کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے گلاس اپنے پاس سائیڈ پر رکھ لیا، پھر ایک طوائف آئی وہ میڈم کے پنجابی گانے پر ''سونے دی تویتڑی'' پر ڈانس کرتے میرے قریب آئی میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے مگر میں نے کوئی رسپانس نہ دیا لیکن اندر میرے کھلبلی سی مچ گئی۔ یہ ڈانس، گانوں اور طوائفوں کا سلسلہ صبح ساڑھے چار بجے تک چلتا رہا اور پھر فجر کی اذان ہو گئی۔

وائی فائی

جب خزاں کے موسم میں زرد پتے درختوں سے جھڑ کر انسان کے قدموں پر گرنا شروع ہو جاتے ہیں تو وقتی طور پر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی ختم ہو رہی ہے مگر دراصل یہ پتے نئی آنے والی زندگی کا پیغام دے رہے ہوتے ہیں کیونکہ ان زرد پتوں کے بعد سرسبز و شاداب بہار اور رنگینیاں ہوتی ہیں۔

میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا ہے میں نے اُسے پہلی دفعہ سہیلی کے ساتھ ایک ہوٹل میں دیکھا لیلیٰ ہم دونوں کی مشترکہ دوست ہے، لیلیٰ کو میں نے کھانے پر بُلایا ہوا تھا لیلیٰ نے مجھ سے پوچھا اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنی ایک دوست کو ساتھ لے آؤں؟ میں نے جواب دیا، مجھے کیا اعتراض ہوگا اچھا ہے کچھ اُس سے سیکھیں گے اور ہنستے ہوئے کہا ''ہے تے سوہنی نا؟'' تو اُس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔ پھر جب ہم لنچ پر ہوٹل میں اکٹھے ہوئے یہ ہوٹل ایم ایم عالم روڈ پر تھا اور یہاں پر ترکش کھانے بہت اچھے سرو ہوتے ہیں۔ میں چونکہ میزبان تھا اِس لئے میں جلدی ہوٹل پہنچ گیا میرے ساتھ دو احباب اور تھے جو کہ بڑے اچھے، شگفتہ مزاج ادب شناس لوگ تھے تقریباً دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد لیلیٰ اور اُس کی دوست ہوٹل میں داخل ہوئی۔ لیلیٰ نے حسب معمول سُرخ رنگ کی چھوٹے بٹنوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح اُس کی قمیص کے پہلے دو بٹن کھلے ہوئے تھے، بلیک رنگ کا ٹراؤزر اور ہائی ہیل کے ساتھ وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی آتے ہی اُس نے سلام کیا اور ساتھ ہی تعارف کروایا کہ یہ میری ہر دلعزیز دوست شبانہ ہے۔

شبانہ لیلیٰ کے مقابلے میں بڑی ماٹھی نظر آئی اُس نے عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے کشادہ پیشانی

بالوں کی ایک لٹ دائیں آنکھ تک آئی ہوئی تھی، ناک میں کوکا چمک رہا تھا بڑی بڑی آنکھیں جھکی ہوئیں تھیں۔ بڑے ہی دھیمے انداز میں اُس نے سلام کا جواب دیا، خیر ہم لوگ روایتی تعارف کے بعد ٹیبل پر بیٹھ گئے اتنے میں ویٹر نے آکر مینو کارڈ دیا۔ سب لوگ کارڈ دیکھنے لگ پڑے میں نے بطور میزبان بڑی خوش دلی سے کہا کہ آپ لوگوں نے جو جو کھانا ہے اپنی مرضی کا آرڈر دے دیجئے میں مینو پر قیمتیں دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یار کوئی آرڈر زیادہ مہنگا نہ ہو جائے، خیر سب نے اپنی اپنی مرضی سے آرڈر دے دیا اور ویٹر نے کہا پندرہ سے بیس منٹ لگیں گے اتنے میں ویٹر نے منٹ صرف کر دیا اور ہم لوگ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔

لیلیٰ نے بتایا کہ وہ آجکل اپنی نئی آنے والی کتاب پر کام کر رہی ہے مسودہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور اب اُس کی پروف ریڈنگ ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ عابد تھے جو کہ لاہور میں ہی رہتے ہیں اور ایک سرکاری ادارے میں بڑے افسر ہیں ادبی طور پر کافی اداروں اور بڑے لوگوں سے اُن کا تعلق رہتا ہے۔ اُنھوں نے لیلیٰ سے کہا کہ آپ کو کہیں پر بھی کسی قسم کی کوئی ضرورت کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ہو تو بندہ حاضر ہے۔ لیلیٰ اور عابد آپس میں باتیں کر رہے تھے، میں نے چپکے سے اپنی آنکھوں کا ''وائی فائی'' آن کیا اور شبانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی مگر اُس نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی میرے وائی فائی کا پاس ورڈ آن نہیں کیا مگر میں مسلسل اِسی کوشش میں لگا رہا۔ جب میری نظر شبانہ کی کلائیوں پر پڑی تو اُس کے بازوؤں پر مجھے بال نظر آئے، مجھے ایسی خواتین پسند ہیں جن کے بازوؤں اور ٹانگوں پر بال ہوں۔ میں نے شبانہ سے پوچھا، آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا، عملی زندگی میں کیا کرتی ہیں؟ اُس نے مختصر سا جواب دیا، جی میں ڈرامے لکھتی ہوں۔ میں نے ہنس کر کہا، کیا آپ کے ڈراموں میں کوئی ہمارا کردار بھی ہو سکتا ہے؟ شبانہ اس سوال کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی وہ ایک دم بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی، سب نے زور کا قہقہہ لگایا، مگر میں اندر سے تھوڑا سا شرمندہ ہو گیا کہ شبانہ کو ایسا سوال کیوں کیا۔

اب وہ چپکے چپکے کبھی کبھی سب سے آنکھ چرا کر مجھے دیکھنے لگی تھی اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ لیلیٰ نے میرے جیسے مجنوں کے لئے ایک بہت اچھی لیلیٰ شبانہ کی صورت میں ملوا دی ہے۔

میں کیا کروں کہ میرا دل خوبصورتی کہیں پر بھی ہو کیسی بھی ہو پسند کرتا ہے، خوبصورتی تو رب کو بھی پسند ہے میرے دل میں بے شمار خیالات موجزن ہو چکے تھے، جی چاہ رہا تھا کہ بہت جلد شبانہ سے فری ہوں اُس کا نمبر مانگوں مگر چار پانچ لوگوں میں بیٹھے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شبانہ دیکھنے میں عام سی تھی مگر لیلیٰ کے مقابلے میں بہت خاموش، سنجیدہ اور کم گو تھی شاید یہی چیز مجھے اُس میں بھا گئی۔

اتنے میں ہمارا آرڈر تیار ہو چکا تھا ویٹر نے پلیٹیں لگانا شروع کر دی تھیں ایک آرڈر میں شوارما تھا میں نے مٹن چانپ منگوائی تھی، عابد نے سپیشل ترکش کباب منگوائے تھے جو کہ نہایت ہی لذیذ ہوتے ہیں اور باقی لوگوں نے اپنی اپنی پسند کی دوسری چیزیں آرڈر کی ہوئی تھیں پھر ویٹر نے سافٹ ڈرنک کے بارے میں پوچھا۔ پھر ہم سب کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔

ہم لوگ کھانے کھاتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی تازہ تخلیق کردہ شاعری افسانہ کہانی بھی سُنا رہے تھے اور اور ایک دوسرے کو واہ واہ بھی کہہ رہے تھے مگر شبانہ تمام وقت میں خاموشی سے آنکھیں جھکائے کھانا کھا رہی تھی، اُس کی اُردو بہت شستہ تھی اور وہ بڑے دھیمے لہجے میں بولتی تھی، اُس کی یہ ادائیں میرے دل پر ستم ڈھا رہی تھیں اور میں اپنے دل کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا، آنکھیں بار بار شبانہ کے چہرے کا طواف کرنے چلی جاتیں اور شبانہ کا چہرہ میری آنکھوں کے طواف سے دھیرے دھیرے حیا سے سُرخ ہو رہا تھا۔ آخر میں ہم سب نے سپیشل ترکش قہوہ پیا۔

ویٹر نے تھوڑی دیر کے بعد مجھے بل لا کر دیا، جب میں نے ٹوٹل بل کی رقم دیکھی تو سانس میں سانس آیا، کیونکہ بل میرے پرس میں پڑے ہوئے پیسوں کے مطابق تھا میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بل ادا کر دیا۔ لیلیٰ نے مجھ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا آپ لاہور میں اور کتنے دن ہو؟ میں نے کہا بس دو دن اور ٹھہرونگا اپنے پبلشر سے ملوں گا اُس کے بعد ایک دو ٹی وی ریکارڈنگز ہیں، وہ کروں گا۔ لیلیٰ نے ایک دم کہا تم راحیلہ سے نہیں ملو گے؟ راحیلہ، لیلیٰ کی بڑی بہن اور میری بہت اچھی دوست ہے، میں نے کہا شاید مشکل ہو جائے تھوڑا سا مصروف ہوں ہاں اگر تم سے راحیلہ کی بات ہو تو میری طرف سے معذرت کر لینا۔ لیلیٰ نے کہا نہیں بھئی نہیں وہ بہت سخت ہے، میں تو نہیں کر سکتی میں نے پھر ڈرتے ڈرتے کہا کہ شبانہ آپ راحیلہ سے بات کر لیجئے گا مگر شبانہ کہیں اور کھوئی

ہوئی تھی شاید اپنے ڈرامے کے کسی پلاٹ میں۔ایک دم چونک پڑی اور ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا جی آپ نے کیا کہا میں سمجھی نہیں؟ میں نے کہا ''خدا کرے کہ نہ سمجھے کوئی ہماری بات'' اور پھر ہم سب نے بھرپور قہقہہ لگایا اور ہوٹل سے باہر اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف چل پڑے۔

چلتے چلتے میں نے شبانہ سے کہا اگر ناراض نہ ہو تو ایک عرض کروں؟ اُس نے کہا، جی فرمایئے۔ میں نے کہا اپنا فون نمبر دے دیجئے تو اُس نے کہا کہ جی ضرور پھر اُس نے اپنا مجھے نمبر لکھوا دیا اور میں نے جلدی سے اُس نمبر کو اپنے موبائل میں سیو کر لیا اور اپنے موبائل سے بیل مار کر کہا کہ شبانہ یہ میرا نمبر ہے اگر دل کرے تو اِس کو فدوی کے نام سے سیو کر لیجئے گا۔

سردیوں میں لنچ ٹائم جلدی گزر جاتا ہے جب ہم ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے تو عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں سائے لمبے ہو چکے تھے دھوپ میں تمازت نہیں تھی مگر میرا دل تھا کہ اُس میں جوش تھا حرارت تھی گرمی تھی پیار کی شدت تھی کہ اب میں کیسے اور کیوں کر شبانہ کے قریب ہو سکوں گا۔ کیا وہ مجھ سے فون پر بات کرے گی یا مجھے ہی پہلے فون کرنا پڑے گا؟ اِسی کشمکش میں ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے اجازت لی اور اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ جاتے ہوئے شبانہ نے ایک دفعہ آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے میرے ''وائی فائی'' کا پاس ورڈ ''آن'' کر دیا ہے۔

ذات پات

محبت ہے کیا چیز، یہ آج تک نہ کوئی سمجھ سکا نہ کوئی اور نہ ہی شاید کوئی سمجھ پائے گا، چند سر پھروں نے محبت سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اُس میں اُلجھ کر رہ گئے۔ عارف بھی ایک ایسا نوجوان تھا جس نے محبت کرنی اور سمجھنے کی کوشش کی، عارف کا باپ جولاہا تھا۔ عارف کے ماں باپ دونوں گھر میں بیٹھ کر ہاتھ کی کھڈی سے کھیس بنایا کرتے، پھر اُن کھیسوں کو عام بازار کی قیمت سے کم قیمت پر اپنے محلے کے ہمسایوں اور اپنے جاننے والے دوست احباب میں فروخت کرتے۔ اِس طرح اُن کا گزر بسر ہو رہا تھا، زندگی معمول پر تھی، عثمان جٹ کے گھر سے عارف کے والدین کو سال کے گندم کے دانے مل جایا کرتے تھے۔

عارف کے گھر میں ایک جست کا بہت بڑا (پڑولا) پڑا ہوتا تھا جس میں کہ عارف کی ماں گندم کے دانے رکھ دیا کرتی تھی پھر حسب ضرورت جتنی گندم چاہیے ہوتی تھی نکال لیا کرتی پھر عارف کو ایک تھیلی میں ڈال کر دیتی کہ جا پُتر چکی پر جا کر شوقے سے آٹا پسوا لا۔ عارف تھیلا اُٹھاتا اور شوقے کی چکی پر چلا جاتا، شوقے کا طریقہ کار یہ تھا، یا تو وہ چار آنے کلو کے حساب سے پیسے لیتا یا پھر گندم میں سے دانے نکال لیتا پسوائی کے حساب میں لیکن عارف کو ماں ہمیشہ پیسے ہی دیا کرتی کہ یہ شوقے کو پسوائی کے پیسے دے دینا۔ عارف گندم کی تھیلی رکھ کر دوستوں کے ساتھ گاؤں میں دور نکل جاتا اور گرمیوں میں گھنے بوہڑ کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا۔ سردیوں کے موسم میں یہ لوگ کھلی دھوپ میں کھلی زمینوں پر لیٹ جایا کرتے اور دھوپ کا لطف اُٹھاتے۔

عارف اُن دنوں ایف ایس سی کی تیاری کر رہا تھا، کیونکہ اُسے شوق تھا ڈاکٹر بننے کا، اُس کے گاؤں میں سوائے ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے باقی سب جعلی ڈاکٹر، کمپوڈر، حکیم، اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر اپنی اپنی دُکانیں لگائے بیٹھے تھے، خدا خدا کر کے ایف ایس سی کے امتحان آئے، عارف امتحانات کے بعد اپنے ماں باپ کے ساتھ وہی اپنا آبائی کام کرنے لگ پڑا تاکہ گھر کا چولہا چلتا رہے اور اُس کے میڈیکل کالج میں داخلے کی فیس کا بندوبست ہو سکے۔ جب رزلٹ آیا تو عارف نے بورڈ میں ایف ایس سی میں ٹاپ کیا اُسے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں داخلہ مل گیا، عارف کے پاس ملتان جانے کا کرایا بھی نہیں تھا، بڑی مشکلوں سے ماں نے کچھ قرضہ اُٹھا کر اُس کے لئے نیا بستر، چند برتن، دو کپڑوں کے جوڑے خریدے اور ٹرین کا ٹکٹ لے کر عارف کو ملتان روانہ کر دیا۔

ماں باپ نے ملتان جانے سے پہلے عارف کو پاس بٹھایا اور کہا بیٹا، دھیان رکھنا پڑھائی میں لاپرواہی نہیں کرنا کسی غلط مجلس اور محفل میں نہیں بیٹھنا، اللہ کے بعد تو ہی ہمارا سہارا ہے۔ عارف چپ بیٹھا سب کچھ سنتا رہا اُس نے ماں باپ سے اجازت لی کیونکہ اُس کا دوست سکندر اُسے اسٹیشن چھوڑنے کے لئے باہر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر دونوں دوست تانگے پر بیٹھے اور اسٹیشن پہنچ گئے ابھی ٹرین آنے میں کچھ وقت تھا لہٰذا سکندر اور عارف نے اسٹیشن پر بیٹھ کر چائے کا ایک ایک کپ پیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹرین آ گئی اور ریلوے اسٹیشن پر ہلچل سی مچ گئی، گاڑی ابھی رُکنے نہیں پائی تھی کہ قلی حضرات نے بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا، جن مسافروں کے پاس سامان زیادہ تھا اور اُن کے بچے بھی ساتھ تھے اُنھوں نے قلی کر والیا۔

ایک قلی عارف کے پاس آیا اور کہا باؤ جی، لائیں یہ سامان مجھے دیدیں میں پکڑ لیتا ہوں، مگر عارف نے کہا، نہیں نہیں ٹھیک ہے میں خود اُٹھا لوں گا۔ سکندر نے جلدی جلدی عارف کا ڈبہ تلاش کیا جس میں عارف کی سیٹ بک تھی کیونکہ ٹرین نے صرف تین منٹ رُکنا تھا اسٹیشن پر۔ پھر سکندر نے جلدی سے ٹرین کے پائیدان پر کھڑے ہو کر عارف کا سامان لیا اور کہا اب تم اوپر آ جاؤ، یہ تمہارا ڈبہ ہے یہ 9 نمبر سیٹ تمہاری ہے اور اِس کے اوپر جو برتھ ہے وہ بھی تمہاری ہے تاکہ جب رات کو تم سونا چاہو یا آرام کرنا چاہو تو اس برتھ پر لیٹ جانا۔

ٹرین کا سفر بہت لمبا اور تھکا دینے والا تھا کئی گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد ٹرین بالآخر صبح سویرے ملتان ریلوے اسٹیشن پہنچی ، عارف پر نیند کا غلبہ تھا مگر پھر بھی اُس نے ہمت کر کے اپنا سامان اُٹھایا اور ٹرین سے نیچے اُترا ، نیچے اُتر کر اُس نے سب سے پہلے دس پندرہ منٹ ایک بینچ پر بیٹھ کر آرام کیا چائے کا کپ اور ایک بن لے کر ناشتہ کیا پھر اپنے میڈیکل کالج کی طرف روانہ ہو گیا ، وہاں پہنچ کر اُس نے اپنے کاغذات ایڈمن میں جمع کروائے ۔ ایڈمن والوں نے پوچھا آپ ہاسٹل میں رہیں گے تو عارف نے کہا نہیں جی میرے پاس جگہ ہے ۔ ایڈمن سے فارغ ہو کر عارف کالج کے قریب ایک مسجد میں چلا گیا ، وہاں پر جا کر غسل کیا ، مسجد کے خادم سے ملاقات ہوئی ۔ خادم نے پوچھا ، آپ مسافر لگتے ہیں ؟ عارف نے کہا ، جی ہاں مسافر ہوں اور پڑھائی کے سلسلے میں آیا ہوں ، یہاں میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہوا ہے مگر میرے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔ خادم نے کہا آپ فکر نہ کریں میں مولوی صاحب سے کہہ کر آپ کے رہنے کا بندوبست کروا دوں گا ۔

وہ بھلے دن تھے جب لوگ ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے تھے ایک دوسرے کا دھیان رکھا کرتے تھے ، ایک دوسرے کی مشکلات ختم کرنے یا کم کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔ پھر خادم کی سفارش پر مولوی صاحب نے عارف کو مسجد میں چھوٹا سا کمرہ دے دیا ساتھ میں کہا کہ آپ کو مسجد میں کھانا بھی فری ملا کرے گا ۔ مسجد کے مدرسے کے طالب علم لوگوں کے گھروں میں جا کر ، ایک نے ہاتھ میں ٹین پکڑا ہوتا تھا اور دوسرے طالب علم نے ٹوکری سر پر اُٹھائی ہوتی تھی وہ محلے میں گھر گھر جا کر دو پہر اور رات کو آواز لگایا کرتے تھے ”وظیفہ جی“ ۔ پھر ہر گھر میں استطاعت کے مطابق جو کچھ بھی پکا ہوتا تھا لوگ ٹین کے کنستر میں تھوڑا تھوڑا ڈال دیتے تھے اور چند ٹکڑے روٹی کے ٹوکری میں رکھ دیتے تھے ۔ جب یہ دو طالب علم مسجد واپس لوٹتے تو کنستر مختلف سالن ، دالوں ، سبزیوں اور گوشت مرغی سے مل کر بھرا ہوتا تھا ، ٹوکری میں کچھ پوری ، کچھ آدھی کچھ آدھی سے بھی کم ٹکڑے روٹی کے ہوا کرتے تھے ۔ اِس تمام کھانے کو مدرسے کے طالب علموں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور یہی کھانا عارف کو بھی دے دیا جاتا تھا ۔ عارف کھانا کھا کر شکر ادا کرتا ، نماز پڑھتا اور پھر رات دیر تک اپنی پڑھائی میں مشغول ہو جاتا ۔

میڈیکل کی پڑھائی بہت مشکل ہوتی ہے عارف آہستہ آہستہ اپنے کالج میں لائق سٹوڈنٹس میں شمار ہونے لگا پھر اُس کی دوستی فائزہ سے ہوگئی جو کہ اُس کی کلاس فیلو تھی۔ فائزہ دیکھنے میں اتنی خوبصورت نہیں تھی مگر اُس کو لباس زیب تن کرنے کا انداز آتا تھا وہ بھلے، میلے کپڑوں میں بھی آجاتی پھر بھی خوبصورت نظر آتی اور جس دن خاص تیار ہو کر آتی اُس دن تو کالج میں قیامت کی لہر دوڑ جایا کرتی تھی۔ عارف کے ساتھ وہ اپنی پڑھائی کے بارے میں گفتگو کرتی، مڈٹرم امتحانوں کے بارے میں مشورے لیتی، پھر فائنل پروف آتا تو تین چار دوست مل بیٹھ کر تیاری کرتے۔ فائنل پروف کے امتحان کے بعد عارف فرسٹ آتا اور کبھی فائزہ۔ فائزہ کا تعلق مذہبی خاندان سے تھا اُس کے والد اپنے بزرگوں کی گدی کے سجادہ نشین تھے جبکہ عارف نے فائزہ کو اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا کہ میں ایک غریب خاندان کا لڑکا ہوں میرے پیچھے کوئی دولت جاگیر اور مربے نہیں لہٰذا ہو سکے تو میرے ساتھ Serious مت ہونا میں آپ کے ساتھ پیار تو کر سکتا ہوں مگر شادی نہیں کیونکہ میری اوقات اتنی نہیں ہے۔ مگر فائزہ جو کہ اپنے ماں باپ کی مالی حیثیت اور جاگیردارانہ سوچ رکھنے والی لڑکی تھی اس نے ہمیشہ سے جس چیز کو چاہا اُسے حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اُس کا عارف کے بارے میں بھی یہی خیال تھا کہ عارف اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ شادی کر کے گھر داماد بن کر رہ سکے گا۔

پڑھائی کا سلسلہ چلتا رہا، فائزہ اور عارف کی محبت پورے کالج میں خوشبو کی طرح پھیل چکی تھی مگر عارف کسی طور بھی فائزہ کو اون کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ میڈیکل کا آخری سال چل رہا تھا، فائزہ نے عارف سے کہا، میرا خیال ہے کہ اب تم میرے بابا جانی سے ایک ملاقات کر لو تا کہ وہ تم سے مل لیں اور پھر ہماری شادی کی راہ ہموار ہو سکے۔ عارف نے فائزہ کی طرف حیرانگی سے دیکھا اور کہا تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، کبھی کمخواب کے لباس میں بھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے؟ وہ ہنس پڑی، جناب آپ کو کیا پتا کمخواب کون ہے اور ٹاٹ کون۔

عارف نے کہا نہیں فائزہ مجھے زمین پر ہی رہنے دو، میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں ہے، ہم اچھے دوست تھے اور اچھے دوست ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مگر فائزہ امیر ضدی لڑکی ہونے کی وجہ سے یہ ماننے کو تیار

نہیں تھی۔ بالآخر ایک دن فائزہ کے اصرار پر عارف کو اس کے گھر جانا پڑا۔ فائزہ کا گھر محل نما تھا، جس کمرے میں فائزہ نے عارف کو بٹھایا وہ کمرہ بے شمار قیمتی نوادرات سے سجا ہوا تھا جو قالین اُس کمرے میں بچھے ہوئے تھے نہایت قیمتی تھے جو صوفے اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اُن کی تو کوئی مثال نہیں تھی۔ عارف ابھی پوری طرح اُس کمرے کی اشیاء سے مانوس بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ایک چھ فٹ کے ساٹھ سالہ بزرگ سر پر پگڑی باندھے ہاتھ میں سوٹی پکڑے کمرے میں داخل ہوئے، اُس وقت فائزہ اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ عارف احتراماً کھڑا ہو گیا اور جھک کر سلام کیا۔

بزرگ نے گرج دار آواز میں کہا، بیٹھو بیٹھو تشریف رکھو کیا نام ہے تمہارا بیٹا؟ جی عارف مسکین۔ بزرگ کو ہلکا سا جھٹکا لگا "عارف مسکین"؟ میرے والد صاحب کا نام محمد مسکین ہے جی۔ بزرگ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی جو کہ عارف نے بڑی شدت سے سے محسوس کی مگر وہ ہاتھوں میں ہاتھ دبا کر اور نگاہیں نیچی کر کے چپ بیٹھا رہا۔

پھر فائزہ کے والد کی آواز کمرے میں گونجی، ہماری بیٹی فائزہ نے تمہاری بہت تعریف کی ہے کہ تم نے پورے پانچ برس بڑے اچھے طریقے سے کالج میں میڈیکل کی تعلیم کے حوالے سے اُس کا بڑا ساتھ دیا، اُس کو اچھے طریقے سے تمام مضمونوں کے بارے میں سمجھاتے رہے جس کی وجہ سے وہ اپنا میڈیکل پانچ برسوں میں مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئی، اس کیلئے ہم تمہارے بہت مشکور ہیں کہ تم نے ہماری لاڈلی اور نالائق بیٹی کو ڈاکٹر بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اور ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے والدین کیا کرتے ہیں کیا وہ بھی زمین دار ہیں؟

عارف خیالوں میں اِس قدر گم ہو چکا تھا کہ اچانک سر اُٹھایا اور یہی سمجھ آئی کہ وہ بھی زمیندار ہیں، تو عارف نہیں ہڑ بڑا کر کہا، نہیں جی، میں ایک جولاہے کا بیٹا ہوں میرے ماں باپ نے کھیس بُن بُن کر مجھے پالا پوسا، پڑھایا، جوان کیا اور آج میں آپ کے سامنے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بیٹھا ہوں۔ میں آپ کے شہر میں ایک مسجد میں پانچ برس تک رہا ہوں اور وظیفے کی روٹیاں کھا کھا کر میں نے میڈیکل پاس کیا ہے جی۔ میں بھلا کیسے زمین دار اور جاگیر دار ہو سکتا ہوں جی۔ فائزہ کے والد ایک دم غصے میں آ گئے اور کہا تمہاری جرأت کیسی ہوئی کہ تم نے میری بیٹی کے ساتھ شادی

کرنے کے بارے میں سوچا؟ ابھی عارف کچھ بولنا چاہتا تھا کہ فائزہ کے والد نے ملازموں کو آواز دی اور کہا اِسے لے جاؤ اور اُٹھا کر گھر سے باہر پھینک دو۔ اتنے میں کمرے میں فائزہ آ گئی، فائزہ نے کہا، بابا جانی آپ ایسا نہیں کر سکتے عارف میری محبت میری چاہت میری پسند ہے اور آپ کو یاد ہے نہ کہ میں نے ساری زندگی جب بھی جہاں بھی جس چیز کی فرمائش کی ہے آپ نے مجھے وہ ہر قیمت پر لے کر دی ہے۔ آج میری آپ سے فرمائش ہے کہ میں عارف سے شادی کرنا چاہتی ہوں اِس کے لئے بھلے مجھے کتنا ہی پیسہ لگانا پڑے آپ کو میری یہ ضد ماننی پڑے گی۔

فائزہ کے والد کا لہجہ نرمی میں تبدیل ہو گیا اُنھوں نے ملازموں کو اشارہ کیا کہ وہ باہر چلے جائیں، ملازم خاموشی سے باہر چلے گئے پھر فائزہ کے والد عارف سے مخاطب ہوئے، ڈاکٹر صاحب ہماری کچھ شرائط ہیں اگر آپ وہ پوری کر دیں تو ہم آپ کی شادی اپنی بیٹی کے ساتھ کرنے کیلئے تیار ہیں پہلی شرط یہ ہے کہ آپ کو اپنے والدین چھوڑنے پڑیں گے، اپنا گاؤں اپنی ذات اپنا پیشہ چھوڑنا پڑے گا۔ عارف خاموشی سے سب کچھ سُنتا رہا پھر آخر میں بولا، جناب والا بے شک میں آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں کسی دُکان پر پڑا ہوا بے جان کھلونا ہوں جس کو آپ اپنی بیٹی کی ضد پر ہر قیمت پر خرید سکتے ہیں۔

یہ کہہ کر عارف تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ترے بغیر زندگی

ترے بغیر زندگی
بجھتا ہوا چراغ ہے
ترے بغیر زندگی
ادھ کھلا گلاب ہے
ترے بغیر زندگی
بہت بڑا عذاب ہے
ترے بغیر زندگی
اشکِ رواں کی نہر ہے
ترے بغیر زندگی
حادثوں کا شہر ہے
ترے بغیر زندگی
ایک میٹھا زہر ہے
ترے بغیر زندگی
غموں کی سخت دھوپ ہے
ترے بغیر زندگی
نہ رنگ ہے نہ روپ ہے
ترے بغیر زندگی
بے وضو نماز ہے
ترے بغیر زندگی
آواز میں سکوت ہے
ترے بغیر زندگی
چلتا ہوا جمود ہے
ترے بغیر زندگی
بے بسی کی انتہا
ترے بغیر زندگی
عاشقی کی التجا
ترے بغیر زندگی
خاموشی کی ابتداء
ترے بغیر زندگی
فاصلوں کا پل صراط
ترے بغیر زندگی
عشق مجاز کی اطاعت

امین کنجاہی

مکتبہ پاک ادب